کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا
(افسانے)
شیریں نیازی

کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا

(افسانے)

مصنفہ

شیریں نیازی

ترتیب وتہذیب

وکیل احمد رضوی

KHOYE HUYELAMHON KI SADA

by

Sheerin Niazi

Compiled and Edited by

Dr. Wakil Ahmad Rizvi

نام کتاب : کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا (افسانوی مجموعہ)

مصنفہ : شیریں نیازی

ٹیچرس کالونی، ریورسائڈ، بھر کنڈا، ضلع رام گڑھ-829135

موبائل نمبر:- 09234033364

سن اشاعت : 2015

کمپوزنگ : دانش ایاز

سرورق : مجاہدالاسلام

قیمت : -/96 روپے

صفحات : 160

طباعت : نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ موبائل: 9794593055

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ملنے کے پتے

- ☆ ظہیر نیازی، ریورسائڈ، بھرکنڈا، رام گڑھ
- ☆ کرن بک ڈپو، مین روڈ، رانچی (جھارکھنڈ)
- ☆ تاج بک ڈپو، مین روڈ، رانچی (جھارکھنڈ)
- ☆ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ (بہار)

ترتیب

☆☆☆

انتساب

اپنے شریک حیات ظہیر نیازی کے نام
جنہوں نے نہ صرف شریک حیات بلکہ رفیق حیات کا کردار
بحسن وخوبی نبھایا، اور میری ادبی صلاحیتوں کو بنانے سنوارنے
اور میری حوصلہ افزائی میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ
ہی اپنے تمام بچوں کے نام جن کے پیار اور شفقت نے ہمیں
برابر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا اور مرحومہ امی جان کے نام......

شیریںؔ نیازی

پیش لفظ

شیریں نیازی
جھرکنڈا، رامگڑھ

چھ سال کی عمر میں ہی بات بات پر ضد کرنے، رونے دھونے والی ایک بچی کو حالات کے تھپیڑوں نے ایسی پٹخنیاں دیں کہ وہ اچانک ہی بے حد سنجیدہ اور خاموش طبیعت بن گئی۔

کئی خواب تھے جو چھوٹی سی عمر میں ہی ٹوٹ گئے۔ والد کا سایہ سر سے کیا اٹھا کہ سب کچھ بدل گیا۔ خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگی۔ تنہائی اور اداسی نے دل میں ایک کہانی کا بیج بویا اور جب کونپل پھوٹی تو اپنوں نے بے حد مذاق اڑایا۔

محنت سے لکھی گئی کہانی پھاڑ کر پھینک دی گئی۔ بڑی چوٹ لگی تھی دل پر، لیکن ماں خود بے حد صابرہ تھیں۔ انہوں نے بس اتنا کہا ''صبر کرو۔'' اور پھر وہ ضدی بچی نہ روئی نہ چلائی۔ نہ کسی سے لڑی نہ جھگڑی۔ پھٹی کہانی کے ٹکڑے سمیٹے اور آنگن میں اُگے امرود کے پیڑ کی جڑ کے نیچے دبا آئی۔

پھر چند ہی دنوں بعد اپنی یادداشت کے سہارے دوبارہ وہی کہانی لکھ ڈالی۔ اور کلکتہ سے نکلنے والے ایک پندرہ روزہ رسالے کو چپکے سے بھیج دیا۔

مہینے بھر بعد ہی وہ کہانی چھپ گئی۔ ڈاکیہ رسالہ گھر پہونچا گیا۔ اس رسالے کا نام۔ ''معمار تھا'' جو ایلیٹ روڈ کلکتہ سے محترمہ رابعہ سلطانہ شاد۔ اور راقم لکھنوی کی

ادارت میں نکلتا تھا۔ میری کہانی پھاڑنے والے مجھ سے اور زیادہ جلن کرنے لگے۔ اور میری ضد میں منشی پریم چند کی کہانیاں اپنے اپنے نام سے نقل کر ڈالیں۔ ''لو ہم بھی کہانی کار بن گئے۔''

لیکن بعد میں یہ پول کھلی تو جنون اتر گیا۔ ہاں یہ بات ہے کہ چونکہ وہ لوگ بڑے بڑے انگلش اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ ایم اے، پی ایچ۔ ڈی وغیرہ کرنے کے بعد ان ہی اسکولوں میں اچھے اچھے عہدوں پر پوسٹیڈ ہوئے خوب پیسے کمائے۔ مگر کہانی کار کوئی نہیں بنا۔

لیکن میں تو یتیم بچی تھی اور اپنی ماں کے دکھوں کے سائے میں پل رہی تھی۔ کہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی اور کیسے کوئی عہدہ پاتی۔ ننھی سی عمر میں ہی میرا تخلیقی سفر شروع تو ہو گیا تھا مگر جاری نہ رہ سکا۔

میرے والد محترم کا نام تھا حسن امام۔ سو میں نے پہلی کہانی محسنہ حسن امام کے نام سے ہی لکھی تھی۔

ایک کہانی محسنہ حسن فرحت کے نام سے لکھی تھی۔ حالات کروٹیں بدلتے رہے۔ میری زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے، کئی بار ٹوٹی، پھر 1962 میں میری زندگی میں محترم ظہیر نیازی صاحب آئے اور انہوں نے مجھے شیریں نیازی نام دیا۔ کچھ دن پورے نام یعنی محسنہ شیریں نیازی کے نام سے لکھا۔ اور شیریں ظہیر نیازی کے نام سے بھی۔

میرے شوہر جناب ظہیر نیازی صاحب نے میرے قلمی سفر کے راستے میں رکاوٹیں نہیں ڈالیں۔ انہوں نے اور کسی معاملے میں میری مدد کی ہو یا نہیں لکھنے کے معاملے میں ہمیشہ میرے مددگار رہے۔ مگر میرے حالات ہمیشہ ناسازگار رہے۔ بار بار ابھرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر ڈوب جاتی ہوں۔

لکھنے کو تو میں کسی طرح لکھ لیتی ہوں۔ مگر میری تخلیقات کی فیئر کاپی بنانا انہیں

لفافوں میں بند کرنا، پوسٹ آفس میں ڈالنا سب کچھ ظہیر صاحب ہی کرتے ہیں۔

میری کوئی چیز کہیں چھپتی ہے تو مجھ سے زیادہ خوشی انہیں ہی ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کی صحت بھی اب بے حد خراب ہو چکی ہے۔ میرے ہاتھ پیر بھی ٹھیک ٹھاک نہیں ہیں۔ میرا تخلیقی سفر رُک رُک کر چلا کرتا ہے۔

پھر بھی پچھلے تین سالوں سے کچھ سلسلہ بنا ہے۔

1991ء میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش لکھنؤ۔ کے مالی تعاون سے چھپی میری کتاب ''ریزہ ریزہ'' کے ایک مضمون ''قدرت کا کرشمہ'' میں جن حالات کا ذکر ظہیر نیازی صاحب نے کیا ہے۔ آج حالات اس سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ لیکن ایک بار پھر ہمت جٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہاں تک پہنچ پاتی ہوں یا حالات کی آندھی مجھے پھر پیچھے کی طرف ڈھکیل دیتی ہے۔

میں ڈاکٹر وکیل احمد رضوی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے پیش نظر افسانوی مجموعے کی ترتیب و تزین سے لیکر کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ تک کی پوری ذمہ داری بحسن خوبی نبھائی۔ انہوں نے اپنی تمام ادبی و تدریسی مصروفیات کے باوجود اپنا گراں قدر دیا۔ اور پوری دلچسپی اور انہماک کے ساتھ تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا اس کیلئے میں ان کی بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

☆☆☆

کچھ اپنی باتیں!

زار زار روئی تھی اُس شام، جب سرخاب کے گلابی ریشمی پروں کو اپنے سامنے بکھرا ہوا پایا تھا۔ اس وقت میری عمر کے پانچ سال پورے ہونے میں کچھ دن باقی تھے۔ شکار کرنا اُس زمانے میں نوابوں اور زمینداروں راجا مہاراجاؤں کی شان ہوا کرتا تھا۔ سو میرے ابو بھی شکار کا شوق رکھتے تھے۔ جب دل کرتا اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ رولس رائس پر سوار ہو کر شکار کو نکل جاتے۔

سانبھر اور چیتل سب مارے مگر گھر میں پورا کا پورا نہیں آتا تھا۔ باہر ہی ذبح کر کے گوشت بانٹ دیا جاتا۔ گھر میں بھی چونکہ گوشت کی شکل میں آتا تھا اس لئے مزے سے کھاتی بھی تھی۔ لیکن جب سُرخاب کا ایک جوڑا شکار کر کے گھر میں آیا اور اس کے گلابی ریشمی پروں کو اپنے سامنے ٹوٹا بکھرا پایا تو حالت بگڑ گئی۔ ان پروں کو گود میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔ اور چیخ چیخ کر رویا کی......کسی کے منائے نہیں بہلی۔ کئی دن بخار میں مبتلا رہی۔ اور پھر ابو میرے آنسوؤں سے ہار گئے۔ جنگل کے شکار سے توبہ کر لی۔ مجھ سے وعدہ کیا کہ اب کبھی وہ اس طرح کا شکار نہیں کریں گے۔ پھر انہوں نے صرف مچھلیوں کے شکار پر اکتفا کر لیں۔ لیکن ان دنوں مچھلیوں کا شکار بھی بڑا جوکھم کا کام ہوا کرتا تھا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ میرے ابو یعنی کہ حسن امام خاں، مچھلیوں کے شکار کے لئے ایسا مسالہ تیار کیا کرتے تھے کہ مچھلیاں دور دور سے کھنچی چلی آتی تھیں۔ شکار پر جانے سے پہلے تمام رشتے داروں اور اڑوس پڑوس والوں کو مسالہ پیس کر تیار رکھنے کو کہہ جاتے تھے۔ تا کہ مچھلیاں پک سکیں۔ اور ان کا کہا بھی خالی

نہ جاتا۔ ہر کسی کو مچھلی ضرور مل جاتی۔

پھر ایک دن یہی شکار کا شوق انہیں بہت دور لے گیا۔ شکار کرتے کرتے شاید ڈھاکہ کے قریب چلے گئے تھے۔ تیسرے دن لوٹے تو گاڑی مچھلیوں سے بھری تھی۔ لیکن خود تیز بخار میں بھُن رہے تھے۔ رات ہوتے ہوتے خون کی قے ہوئی اور پل بھر میں ہی سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس وقت میں تقریباً چھ سال کی تھی اور ابو کی عمر صرف بتیس سال۔ ہنگامے کے دوران ہی (یسین ماموں) مجھے اپنی گود میں اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ میں نے بنا کچھ سمجھے رونا شروع کر دیا تھا۔ "ابھی گھر میں بھوت آ گئے ہیں۔ بیٹا۔ کچھ دیر تم اپنی ممی کے پاس رہو۔ ہم بھوت بھگا کر آتے ہیں۔" انہوں نے سمجھایا۔ ممی (یسین ماموں کی بیوی) مجھے پہلے سے ہی بہت پیار کرتی تھیں کیونکہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ اور یسین ماموں کو تو دراصل ہی نہیں اپنا دوست مانتے تھے۔

لہٰذا، دو دن تک مجھے وہیں رکھا گیا۔ اور تیسرے دن جب میں واپس آئی تو سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ سارے پہچانے چہرے کہیں گم ہو گئے تھے۔ اور امی سفید ساڑی میں لپٹی پتھر کی مورت جیسی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وقت کا پنچھی سیاہ و سفید پر پھیلائے اڑتا رہا۔ بیچ بیچ میں کچھ رشتے داروں کی شکل دکھ جاتی۔ مگر جب بھی کوئی آتا، کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر اپنے ساتھ لیتا جاتا۔

پھر دھیرے دھیرے تینوں گاڑیاں بھی کہیں چلی گئیں۔ ابو اور امی دونوں سخی تھے اور اپنی کوئی بھی چیز کسی کو دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور پھر کچھ نہ بچا۔ چھوٹی سی بات بے بات رونے اور ضد کرنے والی بچی خاموش طبیعت اور سنجیدہ بن گئی۔ امی کی جد و جہد کے دن شروع ہو گئے۔ اپنے رشتے داروں اور پہچان والوں پر اندھے یقین اور بے انتہا محبت کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن پتہ چلا کہ سینٹرل ایونیو کلکتہ (اب کولکاتا) سے HIK تک آٹو موبائل، انجینئر اینڈ ڈیلر، کا بورڈ ہٹ گیا ہے۔ یعنی کہ ابو کی اس ملکیت کو بھی بیچ کھایا گیا۔

امّی کسی سے نہ لڑیں نہ جھگڑیں۔ بس سب سے کنارے ہوگئیں۔ چھوڑ دیا سب کچھ۔ کہا ''کس سے لڑیں۔؟ سب تو اپنوں نے ہی چھینا۔ کوئی بھائی، کوئی بہنوئی، اور کوئی وہ جس پر ترس کھا کر، نہیں سنبھالا گیا، کچھ سکھایا گیا، ان کی زندگی سنواری گئی۔ اور انہوں نے یہ صلہ دیا۔ کچھ لوگ جو اس زمانے میں بچے تھے اب ضعیف ہو چکے ہیں۔ بہت سارے گذر چکے ہیں اور جو زندہ ہیں HIK کی تعریف کرتے ہیں۔ انہیں نیک اور ایماندار بتاتے ہیں۔ بے حد خوب صورت، اسمارٹ اور نفاست پسند کہتے ہیں۔ جب چند دنوں چند ہفتوں اور چند مہینوں میں یہ سب بھی ختم ہو چکے ہوں گے تو کون بچے گا اس کی نشاندہی کرنے کو؟ کیا فیشن کی ہوڑ میں الجھی نئی نسل جو اپنے ماں باپ کو بھی بھول جاتی ہے۔ اپنے ناناؤں، داداؤں کو یاد رکھے گی؟ کوئی اتہاس رچ سکے گی؟

شیریں نیازی

مجسٹنڈ اد امروہہ

عرض مرتب

افسانوی ادب اور شیریں نیازی

ڈاکٹر وکیل احمد رضوی

(صدر شعبہ اردو، راسکوڑھ کالج، راسکوڑھ)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی تمام مخلوقات میں اشرف و افضل بنایا ہے۔ اسی لئے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ اسے نطق گویائی بخشی گئی تاکہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار بہتر طور پر کر سکے۔ یہ عمل ایک مدت دراز سے جاری ہے۔ اللہ نے انسانوں کو علم و حکمت اور عقل و دانست بھی عطا کیا۔ تاکہ وہ خود شناس ہونے کے ساتھ ساتھ زمانہ شناس بھی بن سکیں اور اپنے لئے راہ متعین کر سکیں۔ اس کے لئے اس نے انسانوں کی صحیح رہنمائی اپنے پیغمبروں کے ذریعہ کی۔ غرض یہ کہ وہ سب کچھ دیا جس کی ضرورت تھی۔ دل دیا، دردمندی دی تاکہ وہ دوسروں کے دکھ کو بھی محسوس کر سکیں اور ایک دوسرے کے کام آئیں۔ گویا کہ ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت میں کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ان سب کے ساتھ ہر انسان کو ایک عدد شکم بھی دیا گیا جس سے بھوک و پیاس کا احساس ہوتا ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنی شکم پری پرورش کی کوشش کرتا ہے پھر دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ ترجیحات کے اعتبار سے نزدیک اور دور کے رشتے بنائے۔ انہیں رشتوں کے اعتبار سے دنیا کا پورا نظام چل رہا ہے۔ اس میں ایک اہم رشتہ انسانی اور سماجی تعلق کا بھی ہے، جو ہمیں ایک دوسرے سے جوڑے رکھتا ہے۔ دوسروں کا

بھی خیال رکھنا ان کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، ان کے مسائل کو اپنی صلاحیت کے مطابق حل کرنا، انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اس میں کمی بیشی تو ہو سکتی ہے لیکن یہ جذبہ مفقود نہیں ہوسکتا۔

افزائش نسل کے لئے انسانوں میں مرد وعورت کے جوڑے بنائے گئے۔ آج اولاد آدم کی ایک بہت بڑی آبادی اس زمین پر موجود اور حرکت وعمل میں مصروف ہے۔ ان میں اچھے بھی ہیں، برے بھی۔ ظالم بھی ہیں، مظلوم بھی۔ کمزور وناتواں اور تندرست وتوانا بھی ہیں۔ غریب ومفلس بھی ہیں، دولت منداور صاحب ثروت بھی ہیں۔ خوبصورت اور بدصورت بھی ہیں۔ حساس اور بے حس بھی ہیں۔ غرض یہ کہ انہیں متضاد حالات اور موافق وناموافق صورتحال سے دنیا کی رنگارنگی قائم ہے۔ مرد جہاں اپنی طاقت اور صلاحیت کا استعمال گھر سے لے کر ملک اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کرتا ہے وہیں عورتیں ان کی بہترین صلاحیت کو جلا بخشتی ہیں۔ بچوں کی پرورش، نگہداشت اور بہتر تعلیم وتربیت کے اوصاف سے آراستہ وپیراستہ کرکے انہیں ملک کا اچھا اور وفادار شہری بناتی ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں قوم وملت کا معمار کہا جانا چاہئے۔ عورتیں ایثار وقربانی، صبر وتحمل، توکل، ممتا اور شرافت جیسی جملہ خوبی صفت کی مرکب ہوتی ہیں۔ لطافت، نزاکت اور حساسیت کے باوجود ان کے اندر قوت برداشت کا مادہ مردوں کے مقابلے زیادہ ہوتا ہے۔ یوں تو بنیادی طور پر ان کا دائرۂ کار اندرون خانہ ہوتا ہے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر وہ گھر کی چہار دیواریوں اور اس کے حصار سے باہر نکل کر سرحدوں کی حفاظت تک کے مشکل ترین کام انجام دینے میں مردوں کے شانہ بشانہ بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ ان کے نمایاں کردار اور خدمات کی معترف ہے۔ خود اپنے وطن عزیز ہندوستان کی تاریخ بھی ایسی عہد ساز خواتین کے متحرک اور فعال کارناموں سے مزین ہیں۔ جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی حاضری درج کرائی اور اچھی مثالیں قائم کیں۔ وطن کی حفاظت اور اس کی سالمیت کے لئے پوری کشادہ دلی کے ساتھ اپنی قربانیاں پیش کیں۔

التمش کی بہادر بیٹی اور ہندوستان کی پہلی ملکہ رضیہ خاتون کی بہادری اور دیرانہ ندمات سے کون واقف نہیں؟ ہندوستانی تاریخ کے سرسری مطالعہ سے ہی ایسی کئی نامور خواتین کے نام اور ان کے کارنامے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ چاند بی بی، نور جہاں، ممتاز محل، زینت محل، ہاشمی بائی، حضرت محل، زینت محل، مسز حسن امام، سروجنی نائیڈو، بی اماں، وجے لکشمی پنڈت، مدر ٹریسا، ارونا آصف علی ور بھوپال کی حکمراں بیگمات کے علاوہ سینکڑوں ایسے نام ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی بہادری بلکہ عقلمندی اور دانشوری کا لوہا منوایا۔ میدان کارزار سے لے کر محلوں کے اندر رہ کر بھی حکومت اور سیاست کے شعبہ میں اپنا پرچم لہرایا۔

خواتین کا ایک بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اس سے الگ علم وادب کے حلقے میں بھی نمایاں کارکردگی کو انجام دیا۔ ٹوٹتے بکھرتے، سماج اور معاشرے کی شیرازہ بندی اور صحت مند ادبی روایات کی تعمیر میں قلم وقرطاس کے ذریعہ اپنی صالح فکر، جذبات احساسات، تجربات و حادثات سے دوسروں کو آگاہ کیا۔ انہوں نے سماجی ہم آہنگی، نابرابری، غلط رسومات، ناانصافی اور اپنے تہذیب وتمدن کی حفاظت کے لئے ادب کے تمام شعبوں میں داخل ہوکر آواز بلند کی۔ ادب کی دنیا میں نذر سجاد حیدر، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور پروین شاکر کے علاوہ ایسی سینکڑوں خواتین موجود ہیں جن کی شعری اور نثری تخلیقات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

عصر حاضر کے افسانوی ادب میں ناولوں سے زیادہ افسانوی اور شعری ادب میں نظموں سے زیادہ غزلوں پر توجہ مبذول کی جارہی ہے۔ گویا ادب کے میدان میں یہ سند رائج الوقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کچھ اصناف کی حیثیت اب کلاسیکی ہوچکی ہے۔ جسے ہم ادبی تاریخ کے حوالے سے پڑھتے، جانتے اور سمجھتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے عہد میں ادبی دنیا میں خوب دھوم مچائی، خراج تحسین وصول کیے اور محفل نشیں رہیں۔ ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ موجودہ افسانوی اور شعری

ادب کی تعمیر و ترقی میں ہم نے ان سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

جہاں تک افسانوی ادب کا تعلق ہے تو اس میں افسانوں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد آزادی کے ساتھ سوغات میں ملے درد و غم، اضطراب و بے چینی، انتشار و تفریق، غربت و افلاس، ہجر و جدائی اور نفرت جیسے عوامل نے ہمارے تخلیق کاروں یا افسانہ نگاروں کے حساس ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا۔ انہوں نے اپنے تاثرات کو افسانوی ہیئت میں پیش کر کے حقیقت کی جو آئینہ داری کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آزادی کی 60 دہائیوں میں اردو افسانوں نے کئی کروٹیں لیں اور ان میں بڑی برق رفتار ترقیاں اور تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مختلف ادبی تحریکات و رجحانات کے زیر اثر بھی افسانے لکھے گئے۔ اردو افسانوں میں سہل پسندی اور مشکل پسندی دونوں میں تجربات کیے گئے۔ یہ علامتی، تجریدی، تمثیلی، ایمائیت اور تہہ داری کے دور سے بھی گزرا۔ قاری کے ایک بڑے طبقے نے اس کی سہل پسندی کو ہی پسند کیا۔ ایسے افسانے عام لوگوں میں کافی مقبول ہیں، جس سے قاری کو جگ بیتی میں آپ بیتی کا احساس ہوتا ہے۔ آج اردو افسانہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی پہلی صف میں کھڑا ہے۔ پوری دنیا میں اور بالخصوص برصغیر کے تقریباً تمام ادبی رسالوں اور مجلوں میں افسانے شائع ہوا کرتے ہیں۔ موجودہ نئی نسل کو بھی صنف افسانہ سے والہانہ تعلق ہے۔ اس لئے افسانے بڑی تعداد میں لکھے اور پڑھے جا رہے ہیں۔

جب ہم متحدہ بہار کے افسانوی ادب پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جن میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں۔ نومبر 2000 کے بعد ایک الگ نئی ریاست جھارکھنڈ کے نام سے وجود میں آئی۔ متحدہ بہار میں اس خطے کو چھوٹا ناگپور کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے بعض علاقے بھی اردو شعر و ادب کے حوالے سے اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اس میں جمشید پور، رانچی، پلاموں، گریڈیہہ، دھنباد اور ہزاری باغ وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ لیکن ان علاقوں

کے لکھنے والے 2000 کے بعد سے نہیں بلکہ بہار سے ہی لکھ رہے ہیں۔اس لئے ان کا سرا بہار سے ہی جا ملتا ہے۔البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس خطے کے افسانہ نگاروں کے یہاں مقامی لوک کتھاؤں، آدیباسی تہذیب وتمدن،ان کی سادگی ،جنگلوں اور پہاڑوں کی ہریالی، شادابی اور موافق آب وہوا کا ذکر یا اس کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر ظہ شیم کی تحقیقی کتاب ''جھارکھنڈ میں اردو افسانہ'' کے مطابق بہار میں افسانہ نگاری کی ابتدا1904 سے ہوتی ہے۔انہوں نے بہار جھارکھنڈ میں اردو افسانہ نگاری کی تاریخ اور روایت کو تین ادوار میں منقسم کر کے اس کا محققانہ اور عالمانہ جائزہ لیا ہے۔موصوف کی تحقیق کے مطابق پہلا دور 1927 سے لیکر 1947 تک دوسرا دور 1948 سے1960 تک اور تیسرا دور 1961 سے1980 تک کا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم ابھی جھارکھنڈ میں افسانہ نگاری کے چوتھے بلکہ پانچویں دور سے گزر رہے ہیں۔جائزہ کے لئے دو دہائی کی مدت بھی اہم مدت ہوتی ہے اس لئے چوتھے دور کے طور پر اگر ہم 1981 سے2000 تک اور پانچویں دور کے تحت 2001 سے تا حال کا جائزہ لیں تو افسانہ نگاروں کی دو بڑی کھیپ ہمیں نظر آئیگی۔

ڈاکٹر عبدالمنان کی تحقیقی کتاب ''جھارکھنڈ میں اردو شعر وادب کا ارتقا'' کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو جو اہم افسانہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں۔ان میں ڈاکٹر کہکشاں پروین، ڈاکٹر مسعود جامی اور شمس الہدیٰ انصاری کے علاوہ صابر حسین وغیرہ کا نام شمار کیا گیا ہے۔یہاں تحقیقی تشنگی کا شدید احساس ہوتا ہے چونکہ کئی اہم ناموں کا ذکر نہیں ملتا ہے۔خصوصی طور پر افسانوی ادب کے لیجنڈ اختر آزاد،ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ،انور امام، پرویز عالم مہتاب، انوری بیگم، منظر کاظمی، اختر یوسف، سلطان احمد ساحل، مناظر عاشق ہرگانوی، جمیل اشرف اور علی منیر وغیرہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ جنہوں نے فکشن کی دنیا میں بہر حال اپنی ایک پہچان بنائی ہے اور افسانوی ادب کے معیار ومرتبے میں بہر حال اضافہ کیا ہے۔ڈاکٹر ش اختر نے اس بات پر افسوس کا اظہار

گیا ہے کہ چھوٹا ناگپور" موجودہ جھارکھنڈ" میں یہاں کے ادبی اور لسانی تاریخ کے حوالے سے ابھی تک کوئی مبسوط، معتبر اور جامع تحقیق سامنے نہیں آئی ہے، جو مکمل اور منفرد ہو۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر شاہ اختر بذات خود ایک اچھے افسانہ نگار ہیں، اس کے علاوہ تحقیق وتنقید اور تصنیف وتالیف کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ اور ان کی زیادہ تر تخلیقات سے چھوٹا ناگپور یا جھارکھنڈ کی مٹی اور اس کی آب وہوا کی خوشبو کا فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔

ظہیر غازی پوری کی کتاب "جھارکھنڈ اور بہار کے اہم اہل قلم" (جلد اول) میں کل 20 ادبی وشعری شخصیتوں کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ موصوف خود بنیادی طور پر بہت مشاق شاعر ہیں۔ لیکن تحقیق وتنقید کے شعبے سے بھی ان کی گہری وابستگی ہے اور وہ تنقیدی بصیرت کے حامل شخصیت ہیں۔

بنیادی طور پر وسطی و شمالی بہار سے تعلق رکھنے والی کئی ایسی ادبی شخصیتیں ہیں، جو چھوٹا ناگپور آئے تو یہیں رچ بس گئے بلکہ یہیں کے ہو رہے۔ ان کی ادبی اور دیگر شناخت بھی اسی خطہ ارض کے حوالے سے ہوئی۔ مختار احمد مکی کا تعلق شمالی بہار کے دربھنگہ سے ہے۔ لیکن ان کی تصنیف وتحقیق نے جھارکھنڈ کے حوالے سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ 326 صفحات پر مشتمل ان کی تحقیقی کتاب "جھارکھنڈ کے آدیباسی" کے نام سے شائع ہو کر بازار میں آئی ہے۔ جس میں انہوں نے جھارکھنڈ کے مختلف قبائل اور ان کے تہذیب وثقافت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ 12 ابواب پر مشتمل اس کتاب میں ایک باب آدیباسی زبان وادب، بولیوں، لوک گیت اور رقص پر مختص ہے۔ جس سے جھارکھنڈ کی تہذیب ومعاشرت کو سمجھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اسی معاشرت اور بولیوں کی جھلک یہاں کے مختلف افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

شیریں نیازی بھی جھارکھنڈ کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ لکھنے، پڑھنے سے ان کا تعلق عہد طفلی سے ہی رہا ہے۔ 12 سال کی عمر سے ہی لکھ رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی

تخلیق کا آغاز ادب اطفال سے کیا۔ بچوں کے لئے آسان اردو اور ہندی زبانوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں۔ کہانیوں میں دیو پری، جن بھوت جیسے مافوق الفطرت عناصر سے پرہیز کیا۔ سیدھی سادی اور سچی باتوں کو کہانی کے سانچے میں اس طرح ڈھالا جس سے بچوں کی ذہنی نشوونما اور ان کی شخصیت کی بہتر تعمیر میں ان کہانیوں سے مدد مل سکے۔ بچوں کو ماں سے فطری تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے۔ اس لئے فطری طور پر انہوں نے پہلی کہانی ''ماں کی یاد'' کے عنوان سے لکھی۔ جو 1958 میں کولکاتہ کے ایک رسالہ 'معمار'' میں شائع ہوئی۔ اس کہانی کی سال اشاعت 1958 سے دیکھا جائے تو سال رواں 2015 میں یہ مدت 57 سال یعنی نصف صدی سے زیادہ اور چھ دہائی کے قریب پہنچتی ہے۔ 1962 میں ان کی شادی ایک معروف قلم کار اور فنکار ظہیر نیازی سے ہوئی۔ ادبی اعتبار سے ہم مزاج اور ذہنی یکسانیت و یکسوئیت نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ ابتدائی زمانے میں شوہر نے ان کی ادبی سرپرستی کی ہوگی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بعد میں جو کہانیاں اور افسانے انہوں نے تخلیق کیں اس سے خالص نسائیت اور نسوانی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ شیریں صاحبہ لکھتی بھی رہیں اور چھپتی بھی رہیں۔

ہندو پاک کے مختلف ادبی اور نیم ادبی رسائل و جرائد میں تواتر سے انہیں جگہ ملتی رہی اور ان کی پذیرائی بھی ہوتی رہی۔ علاوہ ازیں ان کی کہانیاں آکاشوانی سے براڈ کاسٹ اور دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ بھی ہوئیں۔ ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''آدمی چڑیا اور کانٹا'' کے نام سے حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ جس میں ادب اطفال کے تعلق سے 11 کہانیاں شامل ہیں۔ شیریں نیازی نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کہانیاں لکھی ہیں، جو ہندی اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئیں۔ کچھ کہانیوں کے ترجمے انگریزی، مراٹھی اور تیلگو میں ہوئے۔ آدمی چڑیا اور کانٹا میں معروف ادیب و شاعر حضرت ناوک حمزہ پوری کا ایک مضمون تحفۂ شیریں کے نام سے شامل ہے۔ جس میں انہوں نے ان کی تعمیری، اخلاقی اور اصلاحی کہانیوں کو کافی سراہا

ہے۔انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''شیریں نیازی اردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔سوئے اتفاق سے شوہر کی ملازمت کی وجہ سے وہ ہزاری باغ کے دیہی علاقے کی ادب دشمن فضا میں ایک ربع صدی کی مدت سے رہ رہی ہیں۔''

ابوالمجاہد زاہد نے بھی ان کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کہانیوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا ہے۔1989 میں لکھے گئے ایک مضمون میں موصوف رقم طراز ہیں۔

''نئے لکھنے والوں میں شیریں نیازی صاحبہ کا نام نمایاں ہے۔اردو کے مختلف رسائل میں اب تک ان کی تین درجن سے زائد کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔وہ ہندی میں بھی لکھتی ہیں اور ہندی کے کئی پتریکاؤں میں ان کی کہانیاں چھپی ہیں۔اب تک دو درجن سے زیادہ ان کی کہانیاں اور افسانے کاشوانی سے نشر ہو کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔''

شیریں نیازی کا زیر نظر افسانوی مجموعہ ایک لمبے عرصے کے بعد سامنے آرہا ہے۔ان کا پچھلا افسانوی مجموعہ ''ریزہ ریزہ'' کے نام سے مارچ 1991 میں شائع ہوا۔بعد میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔جس میں ان کے شوہر کا ''قدرت کا کرشمہ'' کے عنوان سے پانچ صفحے کا ایک مضمون بھی شامل ہے۔انہوں نے ان افسانوں کی تخلیقات کا زمانہ بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں 1972 سے 1985 کے دوران لکھی گئیں۔ان میں ایک دو کا کچھ تعلق 1962 سے بھی ہے اور ایک کہانی ''فرق'' میں 1990 کی جھلک ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ شیریں نیازی کی یہ کہانیاں 1962 سے 1990 تک کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔'' (ظہیر نیازی۔ریزہ ریزہ)

میں نے محترم ناوک حمزہ پوری اور ابوالمجاہد زاہد کے مضامین کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی اس لئے مناسب سمجھا تا کہ ان کی تخلیقات کی اہمیت و افادیت

انہیں حضرات کے الفاظ میں پوری طرح سامنے آجائے۔لہذا مختصر حوالوں کے ساتھ ساتھ ان کے پورے مضمون کو اس کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔

اس طرح کئی اہم لوگوں نے ان کی افسانہ نگاری، اور ادب اطفال کی تعمیری جہت اور اسلوب پر اپنی گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔شیریں صاحبہ 1962 سے لگاتار جھارکھنڈ اور خصوصی طور پر کول فلڈ ایریا بھرکنڈہ ضلع رامگڑھ میں رہ رہی ہیں جہاں بڑے سرکاری ملازمین کے علاوہ بڑی تعداد میں مزدور بھی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے اس علاقے کی امیری اور غریبی دونوں کو دیکھا ہے۔خاص طور سے مزدوروں اور ان کے اہل خاندان کی زندگی میں بہت اندر تک جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ محسوس کیا ہے اسے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا ہے۔

"لے بھیا اب اپنی بھوجی کیلئے ساڑیاں بھی تو لے آ اور سرجو کی لائی ہوئی ساڑی پہن کر جب سرجی لٹو کے سامنے آتی تو ایسا لگا جیسے اس آنگن میں پورا کا پورا بسنت اتر آیا ہے۔"

شیریں کے افسانوں میں نسائیت کا رنگ اور درد و کرب بھی جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

"آج پھر میں تیری کھڑکی پر آ بیٹھی ہوں میں ایک ننھی سی چڑیا اور بہت دور آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے تھک کر چور چور ہوگئی ہوں۔میرے اندر سے درد کی لہریں اچھل اچھل کر مجھے بے چین کئے دیتی ہیں۔"

انہوں نے اس ترقی یافتہ دور میں بھی عورتوں کے حال زار اور انہیں برابر حاشیئے پر بنائے رکھنے کی کوشش پر بھی سوال اٹھایا ہے۔

"آج جب آسمان کی گہرائیاں اور اونچائیاں ناپی جارہی ہیں۔آدمی کے ہاتھ چاند اور ستاروں کو چھو رہے ہیں۔زمین و آسمان کی دوریاں گھٹ چکی ہیں کیا عورت آج بھی اتنی ہی مجبور، اتنی ہی شکتی ہین نہیں ہے؟"

شیریں اپنے افسانوں میں بہترین منظر نگاری پیش کرتی ہیں۔وہ اپنے ساتھ ساتھ قاری

کو بھی مختلف مناظر کی سیر کراتی ہیں۔

"سارا اپنے کھیت کے منڈیر پر کھڑی دور وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اس نے میٹھے چاول اُبالے تھے اور بھیڑوں کا دودھ دوہ رکھا تھا۔ سارا کے سفید بال اس کے شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ انگوروں کی بیلیں مرجھا گئی تھیں۔ کھیتوں میں سوکھا پڑا تھا۔ بھیڑوں کا باڑا سنسان تھا۔"

غرض یہ کہ شیریں کے افسانے اپنے عہد کی سچی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں اپنے جذبوں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو مناسب اور بہترین الفاظ و جملے اور پُر اثر انداز میں پیش کرنے کا ہنر آتا ہے۔ کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک گھریلو اور مشرقی خاتون کے مشاہدے میں اتنی وسعت کہاں سے آئی۔ لیکن یہی ان کی انفرادیت ہے، وہ جہاں رہیں اور جہاں گئیں وہاں سے اپنے افسانوں کے لئے مواد اکٹھا کرتی رہیں۔ اور پھر انہیں سلیقے سے ترتیب دیکر اپنے افسانوں میں پیش کر دیا۔

شکر ہے کہ ان دنوں کالج اور یونیورسٹیوں میں پہلے کی بہ نسبت تحقیق کا کام زیادہ ہو رہا ہے۔ کئی تحقیق و جستجو میں سرگرداں حضرات ان شخصیتوں کو بھی تلاش کر کے سامنے لا رہے ہیں۔ جن پر زمانے کی گرد پڑ چکی ہے۔ کئی تحقیقی مقالوں اور دیگر تحقیقی کتابوں میں شیریں نیازی اور ان کے افسانوں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں یقین ہے کہ شیریں نیازی کے سابقہ افسانوی مجموعہ "ریزہ ریزہ" کی طرح پیش نظر افسانوی مجموعہ "کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا" بھی قارئین کے درمیان شوق سے پڑھا جائیگا۔

٭٭٭

تحفۂ شیریں

ڈاکٹر حمزہ پوری

بچوں کے ادب پر لکھنے کے لئے خواہ جس کسی نے بھی قلم اٹھایا ہو وہ شروعات اسی نوحے سے کرتا ہے کہ ہمارے ملک میں بچوں کے ادب کو کمتر درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کے لئے لکھنے والوں کی وہ قدر و منزلت اور پذیرائی نہیں ہوتی جو دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے اور غالباً اسی لئے اس نوع کے ادب سے ہمارا ادبی دامن ویسا بھرا پُرا نہیں جیسا دوسرے ملکوں اور دوسری زبانوں کے ادب کا ہے۔ یہ باتیں حقیقت سے قریب ہیں۔ اس میں کلام نہیں لیکن اس طرح کی گریہ وزاری سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرح احساس کمتری کا چور ہمارے اپنے دل کے کسی کونے کھدرے میں بھی چھپ بیٹھا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ہم تمام بچوں کے لئے لکھنے والوں کو اس احساس کمتری سے پیچھا چھڑانا چاہئے۔ اور اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ ہم بچوں کے ادیب و شاعر ہیں۔ یادو ہم اُس بنیادی ادب کے تخلیق کار ہیں۔ کوئی ہماری اہمیت نہ سمجھتا ہو تو نہ سمجھے، ہماری پذیرائی نہ کرتا ہو تو نہ کرے۔ ہمیں انعام و اکرام سے نہیں نوازا جاتا تو نہ نوازا جائے۔ ہمارا کام ہی ہمارا انعام ہے۔ کام اسی جذبے سے کرتے جانا چاہئے۔

بچوں کے لئے لکھنا ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے بس کی بات نہیں۔ ہر ادیب و شاعر اپنے ادبی سفر کا آغاز اپنی ''بچکانہ'' تحریروں سے کرتا ہے اور جب ایک مدت تک سخت مشقت ریاض اور مشق کر چکنے کے بعد اس کی تحریروں میں پختگی آتی ہے، زبان کے لسانی ڈھانچے کی کماحقہٗ آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ زبان کے اصول، قواعد و مزاج سے

آشنائی ہوتی ہے۔ تب جا کر بچوں کے لئے لکھنے کی جسارت کرتا ہے۔ ٹیگور کو دیکھئے۔ اقبال کو دیکھئے یا سرور جہان آبادی اور شفیع الدین نیر کو دیکھیے آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔ بچوں کے لئے لکھنا بڑوں کے لئے لکھنے سے زیادہ مشکل مرحلہ ہے۔ میرے خیال میں جب تک آپ بچوں کی بولی ٹھولی، ناز، انداز، ادا، نخرے تلے، روٹھنا، پھولنا ضد، ہٹ، رونا، ہنسنا، مزاج نفسیات اور ان کے ذخیرۂ الفاظ کی مقدار و کیفیت سے واقف نہ ہوں آپ بچوں کے لئے مفید ادب کے خالق نہیں ہو سکتے۔ بچوں کے لئے لکھنا ایک طرح کامیاب ایکٹنگ کی طرح ہے۔ جب تک آپ اپنے وجود کو فراموش کر کے بچوں کے وجود میں حلول نہ کر جائیں اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

اور مجھے مسرت ہے کہ بچوں کے لئے لکھی گئی ان کہانیوں کی مصنفہ ایک عورت ہے۔ محترمہ شیریں نیازی نے بڑوں کے لئے بھی کہانیاں اور افسانے ایک مدت مدید سے لکھتی رہی ہیں۔ شیریں نیازی اردو فکشن کا ایک معروف نام ہے۔ ممتا کا جذبہ تو ان کے سینے میں موجود تھا ہی لیکن انہوں نے بچوں کے لئے اپنے قلم کا رخ موڑنے میں ذرا دیر لگا دی۔ بہر حال امکان یہی ہے کہ دیر آید درست آید کا مصداق بنے گا۔

ہمارے ادبی حلقوں میں ایک خرابی ہے کہ اگر کوئی ادیبہ کسی معروف قلم کار کی بیٹی یا بیوی وغیرہ ہوتی تو ہم قلم کار اس کی تخلیقات کو اس کے متعلقہ رشتہ دار کی مرہون منت قرار دیتے ہیں۔ یہ کرب شیریں نیازی نے بھی جھیلا ہے۔ یہ بات اس زمانے میں ہزاری باغ کے ادبی حلقے سے میرے خاندان میں ذاتی تعلق میں ان کا ہمسایہ ہونے کے ناتے راز درون مجھ سے واقف تھا۔ میں نے ظہیر نیازی صاحب اور شیریں نیازی صاحبہ کے اسلوب میں فرق واضح کر کے اس غلط فہمی کو دور کیا۔ حالانکہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے صرف یہ جان لینا ہی کافی تھا کہ شیریں صاحبہ کی تخلیقات ان کے ظہیر صاحب کی زوجیت میں آنے کے چار سال پہلے سے چھپنا شروع ہو گئی تھیں۔

المختصر یہ کہ شیریں نیازی اردو فکشن کا معتبر نام ہے۔ حسن اتفاق سے شہر کی

ملازمت کی وجہ سے وہ ہزاری باغ کے دیہی علاقے کی ادب دشمن فضا میں ایک ربع صدی
کی مدت سے رہ رہی ہیں۔ ادب میں گروہ بندی تو ہر زبان میں ہے لیکن دوسری زبانوں کا
حلقہ وسیع ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ نمایاں نہیں۔ اردو کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں اور اس تنگی کی
وجہ سے گروہ بندی، حسد، بغض، کینہ، رقابت اور ایک دوسرے کو کچل کر آگے بڑھ جانے کی
وہ خرابیاں ہیں کہ العیاذ باللہ۔ شیریں کسی گروہ سے بھی متعلق نہیں ورنہ دو سو کے قریب
کہانیوں کی تخلیق کاری کم نہیں ہوتی۔ شیریں کے ساتھ انصاف کیا گیا ہوتا تو اردو فکشن
میں ملک گیر پیمانے پر ان کا آج نام و مقام ہوتا۔

یوں بڑوں کے لئے بیس سال لکھنے کے بعد وہ بچوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور
غالباً بچوں کے لئے ان کی پہلی کہانی اوائل ۱۹۷۰ء ماہنامہ کھلونا دہلی میں شائع ہوئی۔
اور اس کے بعد بڑوں کے لئے ادب کی تخلیق کے شانہ بشانہ وہ بچوں کے لئے بھی مسلسل
لکھتی رہیں یہ ہمارے لئے بڑی امید افزا بات ہے۔

اس مجموعے میں کل گیارہ کہانیاں ہیں۔ اس کی آٹھ کہانیاں میں نے پڑھی ہیں
اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان میں بڑا تنوع ہے یعنی اس میں سات آٹھ برس کے ننھے
منوں کی بھی دلچسپی کا سامان ہے بارہ چودہ سال کے بچوں کی دل بستگی کا بھی خیال رکھا گیا
ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بچوں کی پسند و ناپسند کی جتنی پہچان ماں کو ہوتی ہے، باپ کو
نہیں ہوتی۔ ان کی ضرورتوں کا جیسا احساس عورتوں کو ہوتا ہے مردوں کو نہیں ہوتا۔ ان
کہانیوں کے توسط سے یہ دیکھ پرکھ کر مجھے مسرت ہوئی کہ یہ پہچان اور احساس شیریں
نیازی کو ہے۔ اور اس کا اظہار خاصے سلیقے سے انہوں نے کیا ہے۔

انسانی طبع کا خاصہ یہ ہے کہ وہ راست نصیحت کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتی
ہے اور اس لئے اچھی باتوں کی آمیزش اور نیکی کی ترسیل و تبلیغ کے لئے ہمیشہ بالواسطہ
طریقہ کار اختیار کرنا مستحسن ثابت ہوا ہے۔ اگر شیریں نیازی سیدھے سیدھے یہ کہتی چلتیں
کہ دوسروں کی بعض خامیاں دیکھ کر انہیں حقیر نہ سمجھو بلکہ ان میں خوبیوں کا پہلو بھی دیکھو

کرو تو ان کی یہ بات اتنی مؤثر نہ ہوتی جتنا ''نازلی'' کے مختلف کردار چھن، منن، بنن اور ان کی امی کے گرد اگرد واقعاتی تسلسل کی ایک کہانی بن کر انہوں نے اثر پیدا کر دیا ہے۔

بچے فطری طور پر چھوٹے چھوٹے جانوروں، چرندوں پرندوں میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ شیریں نے اپنی مختلف کہانیوں میں گوریا، ببل، کوکل، چیکو اور مینو (خرگوش)، بسنتی (چڑیا) اور کوؤں کا کردار پیش کر کے بچوں کی دلچسپیوں میں اضافے کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

شیریں کی ان کہانیوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہماری جیتی جاگتی جانی پہچانی دنیا میں رونما ہونے والے عام واقعات سے سجائی سنواری گئی ہیں۔ ''...ن رانی'' کا بعض حصہ اجنبی ہوتے ہوئے بھی پوری کہانی کے واقعات کا مجموعی تاثر ہمیں اپنی ہی سوندھی مٹی کی اس دنیا میں لے آتا ہے یوں انہیں بچے چاؤ سے پڑھیں گے۔ اور انہیں کہیں کسی واقعے سے نامانوسیت کی بو نہیں آئے گی۔

سب سے بڑی خوبی ان کی کہانیوں کی یہ ہے کہ یہ محض تفریحی نہیں۔ حالانکہ مجرد تفریحی ادب کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن تفریح کی تفریح میں کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں تو یقیناً نہیں سونے پر سہاگہ کہا جائے گا۔ سونے پر سہاگے والی یہ کیفیت شیریں کی تمام کہانیوں میں پوشیدہ ہے۔

یہ کہانیاں بچوں کے ذہن کو صالح اور مفید ڈھانچوں میں ڈھالنے میں معاون ہوں گی۔ آج دنیا کو امن کی شانتی کی، انسانی ہمدردی کی، مساوات کی، بھائی چارے کی، مذہبی لسانی، علاقائی، رنگی، نسلی رواداری اور ایثار کی جتنی ضرورت ہے اتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ اور یہ خوبیاں صالح خطوط پر آنے والی نسل کی کردار سازی سے ہی میسر آسکتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ کہانیاں یہ اہم فریضہ ادا کرنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ شیریں نیازی اردو کی معروف افسانہ نگار خاتون ہیں اور اس لئے انہیں کہانی بننے کے فن پر اچھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ اپنے اس فنی جوہر سے انہوں نے پیش نظر بچوں کی کہانیوں میں بھی بڑا کام لیا ہے۔

☆☆☆☆☆

شیریں نیازی۔ میری نظر میں

ابوالمجاہد زاہد

بچے آنکھوں کا نور، دل کا سرور، اندھیرے گھروں کا اجالا اور ماں باپ کی امیدوں کا سہارا ہوتے ہیں، بچے کسی قوم کا مستقبل اس کا عزیز ترین سرمایہ ہوتے ہیں اس لئے بچوں کی انسانی اور اخلاقی بنیادوں پر پرورش و پرداخت کرنے اور ان کے اندر تعمیری اور فنی رجحانات کو اجاگر کرنے کی بڑی اہمیت ہے تاکہ آج کے بچے کل کے ذمہ دار، مہذب شہری اور دور نو کے نقیب بن سکیں، بچے تہذیب آشنا اور تربیت یافتہ نہیں ہوتے نہ ان میں سماجی زندگی گزارنے کا شعور ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں ان کے اندر پیدا کی جاتی ہیں۔ اس لئے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت کا خاص طور سے خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

بچوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں "شعر و ادب" سے بھی بڑا مفید کام لیا جاسکتا ہے۔ بچوں میں نظموں اور کہانیوں سے فائدہ اٹھانے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ ادب ان کے لئے صرف تفریح طبع ہی کا سامان نہیں ہوتا بلکہ ان کی سیرت کی تعمیر اور شخصیت کی تشکیل میں بھی اہم رول ادا کرتا ہے۔

اردو زبان کی یہ کم نصیبی ہے کہ اس میں بچوں کے ادب پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی، ہمارے بڑے بڑے ادیب اور نامور اہل قلم تو شاید بچوں کے ادب کو ادب ہی نہیں

سمجھتے۔اور بچوں کے لئے لکھنے اوران کے لئے سوچنے کو اپنی بلند و بالا شان سے فروتر سمجھتے ہیں اور جو ادیب بچوں کے لئے کچھ لکھتے بھی ہیں تو اس کام کو اتنی لاپروائی کے ساتھ انجام دیتے ہیں جیسے ان کے نزدیک اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

بچوں کے اچھے ادب کی کمیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بچوں کے ادیبوں کی ہمارے سماج اور ادبی برادری میں اتنی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہئے۔ ان کے ادب کو ''بچکانہ ادب'' سمجھا جاتا ہے۔ اور انہیں بڑوں کے لئے لکھنے والوں سے کم درجے کا ادیب مانا جاتا ہے اس لئے ممتاز و مشہور ادیب بچوں کے لئے لکھنے لکھانے سے عام طور پر پرہیز کرتے ہیں۔

آج کل عام طور سے بچوں کے لئے جو ادب لکھا جارہا ہے اس میں نہ بچوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی کیفیات کا کوئی خاص لحاظ رکھا جاتا ہے، نہ بچوں کے ادب کو بچوں کی زبان میں پیش کرنے پر پوری توجہ دی جاتی ہے نہ ادب کے تعمیری اور مثبت پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

آج کا ادب بچوں کو نیکیوں پر ابھارنے، ماں باپ استاد اور اپنے بڑوں کی عزت کرنا سکھانے، ان کے اندر ہمدردی اور بھائی چارے کی تڑپ پیدا کرنے کے بجائے الٹا ان پر برا اثر ڈالتا ہے انہیں ڈھیٹ، شریر، منھ پھٹ اور بے ادب بناتا اور ان کی زندگی کو غلط راہوں پر ڈالتا ہے۔

جو ادیب بھی بچوں کے لئے ادب لکھ رہے ہیں انہیں ایسا ادب پیش کرنا چاہئے جو بچوں کے اندر خدا پرستی اور حمایت مظلوم کے جذبات کو پروان چڑھا سکے۔ ان کے اندر تعمیری رجحانات کو اجاگر کرسکے، انہیں اخلاق و انسانیت کے سانچے میں ڈھال سکے اور ان میں ایثار و قربانی، جرأت و ہمت او عدل و انصاف کے جذبات اور سماجی شعور کو ابھار سکے اور انہیں مثبت انداز فکر کے قریب لے جائے۔ اسی طرح ذہنی و جذباتی تربیت کرکے آج کے بچوں کو کل کا فرض شناس شہری اور مستقبل کی ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی سے

ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لائق بنایا جاسکتا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں شیریں نیازی صاحبہ کا نام نمایاں ہے، اردو کے مختلف رسائل میں اب تک ان کی تین درجن سے زیادہ کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ہندی میں بھی لکھتی ہیں اور ہندی کی کئی پتر کاؤں میں ان کہانیاں چھپتی ہیں۔ اب تک دو درجن سے زیادہ ان کی کہانیاں اور افسانے آکاش وانی سے نشر ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

''دمی چڑیا اور کانٹا'' شیریں نیازی کی ان کہانیوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ انہوں نے مافوق البشر کرداروں اور جنوں پریوں والی کہانیاں لکھ کر بچوں کے اندر تحیر تجسس اور خوف پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے تو مضر اور ناخوش گوار رجحانات کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے، بلکہ تعمیری اور مثبت انداز فکر اپنایا ہے۔ انہوں نے ایسے کرداروں کو نمایاں کیا ہے اور ایسی صلاحی، فلاحی اور نصیحت آمیز کہانیاں لکھی ہیں جو نئی نسل پر خوش گوار اثر مرتب کر سکیں۔ ان کی راہوں میں اجالا کر سکیں اور ان کی سوچوں کو تعمیری راستے پر ڈال سکیں۔

انہوں نے بچوں کی کہانیاں بچوں ہی کی آسان، عام فہم اور رشتہ زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ موضوع کا انتخاب بھی وہ بچوں کی ذہنی سطح اور ان کے مزاج کے مطابق کرتی ہیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ بڑی بڑی باتیں بچوں کے ذہن میں اتار دیتی ہیں۔

مثلاً ''ناق'' افسانے میں انہوں نے ایک لڑکے اچھن کا کردار پیش کیا ہے، جو ہمدردی و غم گساری، خدمت والدین اور خدمت خلق کے جذبات کو فروغ دیتا ہے اور دوسروں کے کام آنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ نمونے کے طور پر اس کہانی کا ایک اقتباس حاضر ہے:

> ''آج بھی اچھن سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا چبا کر اور پانی دو گلاس حلق میں انڈیل کر بھاگ نکلا تھا۔ گھر سے نکل کر وہ سیدھا پارک کی طرف ہو لیا اور وہاں پہنچ کر وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے کوئی سال بھر کا بچہ ننھی

سی گیند سے کھیل رہا تھا اور اس کی آیا سامنے والی دکان میں جا کر گھس گئی تھی۔ بچہ اکیلا تھا۔ اچانک اس کی گیند ڈھلکی اور ڈھلوان کی طرف پھسلنے لگی، بچہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ سامنے باہر جانے کی سیڑھی تھی اس کے نیچے فٹ پاتھ اور پھر چوڑی سڑک جس پر بے شمار گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ گھٹنوں کے بل چلتا بچہ سیڑھیوں سے لڑھکا اور فٹ پاتھ پر جا گرا۔ ہاتھوں سے نکل کر ربڑ کی گیند اور زور سے بھاگی اور سڑک پر لڑھکتی چلی گئی۔ بچے کے گھٹنے چھل گئے تھے، گھٹنوں سے نکلتے خون کو دیکھ کر بچہ یک بار رو دیا۔ پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر نیچے اترنے لگا۔ تبھی اچھن نے لپک کر بچے کو اٹھا لیا اور دو تین انچ کے فاصلے سے دھڑ دھڑاتی ہوئی ٹرام آگے نکل گئی۔ بچے کو بچانے کی کوشش میں اچھن کی کہنیاں فٹ پاتھ کے پتھر سے ٹکرا کر پھوٹ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب آیا لوٹ کر آئی تو بچے کو اس کے حوالے کر کے اچھن اسکول کی طف دوڑ پڑا۔

پورے پندرہ منٹ لیٹ تھا وہ"

شیریں نیازی کی کہانیاں سبق آموز بھی ہیں اور اپنے اندر زندگی کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو رکھتی ہیں اور اس لائق ہیں کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کے ہاتھوں تک پہنچائی جائیں اور مصنفہ کی ہمت افزائی کی جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

سوانحی کوائف

ڈاکٹر وکیل احمد رضوی

پورا نام	محسنہ شیریں نیازی
قلمی نام	شیریں نیازی
جائے پیدائش	اکبر پور ضلع روہتاس، ریاست بہار
تاریخ پیدائش	13 دسمبر 1946
والد کا نام	حسن امام خان
شادی	فروری 1962
شوہر نامدار	ظہیر نیازی (اردو اور ہندی کے معروف قلمکار)
مستقل اقامت	کولکاتہ میں 1946 سے 1961
حال مقام	بھرکنڈا، ضلع رامگڑھ (کول فیلڈ ایریا) 1962 تا حال
اولادیں	بیٹا۔ محمد شبیر نیازی
	بیٹیاں۔ فروغ نیازی
	شبنم نیازی
	شاداں نیازی
	شمع نیازی
پہلی کہانی	"ماں کی یاد" اشاعت رسالہ "معمار" کولکاتہ

مارچ 1958

تحریری سلسلہ: 9 سال کی طویل مدت تک خاموشی کے بعد 1967 سے 1985 تک اردو میں کم و بیش 50 کہانیاں اور ہندی میں بھی 50 سے زائد کہانیاں شائع ہوئیں۔

ریڈیو نشریہ: کئی کہانیاں، انٹرویو، ڈرامے اور رافس نے آکاشوانی "رانچی، پٹنہ سے نشر ہوئے۔

ہزار رنگ، دہلی' 1974 سے 2005 تک۔

تراجم: مختلف کہانیاں انگریزی، مراٹھی، تیلگو، گجراتی، کنڑ اور پنجابی زبان کے رسائل میں شائع ہوئیں۔

رسائل و جرائد کے نام (جن میں تخلیقات شائع ہوئیں) 'کھلونا' (دہلی) "شمع" (دہلی) "شاخسار"

(کٹک) "روبی" (دہلی) "زبان و ادب" (پٹنہ) "ایوان اردو" (دہلی) "خرام" (کانپور) "خاتون مشرق" (دہلی) "ہمراز" (گریڈیہہ) "پرواز ادب" (پٹیالہ) "پاسبان" (چنڈی گڑھ) "صبح امید" (ممبئی) "دلی" (دہلی) "بہار کی خبریں" (پٹنہ) "اقبال" (آسنسول) "زیور" (پٹنہ) "آندھرا پردیش" (حیدرآباد) "نگینہ" (سری نگر) "مریخ" (پٹنہ)

بیرون ملک کے رسائل "طلوع" (شوپور کشمیر) "جامع نو" (کراچی) "زیب النساء" (لاہور) "بنات" (کراچی) "عصمت" (کراچی) اور عالمی معیار کی کتابوں میں افسانے شائع ہوئے۔

اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے رسائل: (جس میں تخلیقات شائع ہوئیں۔) ہندی ۔پراگ۔ ہندوستان۔ نیا گیان اودے۔ (بھارتیہ گیان پیٹھ کی پتریکا)۔ گنگنا جل ۔بالیکا سماچار۔ سم کالین بھارتیہ ساہتیہ۔ انگریزی۔ Who s who مراٹھی۔ اپھر پرو۔ ایک اور انتر چھ تیلگو۔ نوایا۔

انٹرویو: آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بزم اردو کا انٹرویو

اخبارات: ہندوستان۔ رانچی ایکسپریس۔ پربھات خبر۔ جاگرتی۔ شائع شدہ

کتابوں کے نام: (1) ریزہ ریزہ (افسانوی مجموعہ) اشاعت مارچ 1991، طابع، بھارت آفسیٹ پریس، گلی قاسم جان دہلی 6۔ (2) آدمی، چڑیا اور کانٹا (کہانیاں ادب اطفال) (3) منٹو اور ٹیلو (بچوں کی کہانیاں) ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ اشاعت 1992 (2010 میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا)

پیش نظر کتاب: کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا (افسانوی مجموعہ) اشاعت 2015، طابع (جسے ڈاکٹر وکیل احمد رضوی، صدر شعبۂ اردو رامگوھ کالج نے ترتیب دیا)

انعامات واعزازات اترپردیش اردو اکادمی۔ آدمی چڑیا اور کانٹا پر۔ بہار اردو اکادمی آدمی چڑیا اور کانٹا (اطفال) کے مشمولات: نالائق، ان رانی، راجو، قصہ انوکھے ماتم کا، آدمی چڑیا اور کانٹا، میکو اور چیکو، کاجل کا کمال، جھوٹ کی پول، کوّے کی عقلمندی، خوبصورت ہاتھ، برکت کا پھول۔

ریزہ ریزہ (افسانوی مجموعہ) کے مشمولات: خون کی پہلی بوند، نظارہ درمیاں ہے، ممّی، اپنی اپنی چوری، پورن، دوپٹہ، کھلی راہوں کا درد، ساز اور دھماکہ، پنجرا، نیم کی نبولیاں، اماں بی، ریزہ ریزہ گواہی گل مہر کی، ایک پتہ پت جھڑ کا، پانسہ، خون کا رنگ، سرمایہ ۔منٹو اور ٹیلو (بچوں کی کہانیاں) بچوں سے متعلق مختلف تعمیری اور اصلاحی کہانیاں۔

زیر طبع کتابیں: (1) قبر سے واپسی
(2) کیسے پہنچا منٹو مریخ پر
(3) کہانی ایک چمن کی

☆☆☆

کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا

سارا دن شعلے برسانے کے بعد آفتاب نے اپنا چہرہ پہاڑوں کے سیٹی آنچل میں چھپا لیا ہے اور شام کے سرمئی سائے رات کے سیاہ پردوں میں سمٹتے جا رہے ہیں۔ کوٹھری کے ایک کونے میں تکونے طاق پر ایک ننھا سا دیا جھلملا رہا ہے اور میرے سامنے رکھی چائے کی پیالی میں سے بھاپ اُڑ اُڑ کر ہوا میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔ میرے سامنے پچھلی دیوار کی طرف خالی کھری چارپائی پڑی ہوئی ہے۔ یہ چارپائی پچھلے پچیس برسوں سے وہیں تکی ہوئی ہے، میں پانچ سال کی عمر سے اس اس چارپائی کو وہیں دیکھتا آیا ہوں۔ میرے بچپن سے جوانی تک کی تمام یادگاریں، تمام خوشیاں، تمام آنسو، تمام شرارتیں اسی چارپائی کے ارگرد گھومتی رہتی ہیں۔ آج سے سات سال پہلے اپنی تمام یادو ں، تمام باتوں کو اسی چارپائی کے پاس چھوڑ کر میں پردیس گیا تھا تو کچھ مہینوں تک یہ میر پیچھا کرتی رہی تھی، پھر رفتہ رفتہ وہاں کے ماحول میں رچ جانے کے بعد یہ یادیں دھندلی ہوتی گئیں۔ وہاں کے جگمگاتے حالات نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ ایسے میں ان مٹی کی دیواروں کی سوندھی مہک پرفیوم کی تیز بھبھک سے شکست کھا کر اندر دل کے نہاں خانوں میں کہیں جا چھپی، نتھنے تیز خوشبو کے عادی ہو گئے تو مٹی کی مہک کو محسوس کرنا بھول گئے۔

وہاں کی شہریت لینے کے بعد میں یہاں کا سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں بھول گیا جب کہ میرا کہیں کچھ نہ بچا تھا تو ان دیواروں نے ہی مجھے پناہ دی تھی۔ اسی چارپائی نے مجھے نیند بھر سلایا تھا۔ پھوپھی اماں کے سفید بے داغ دوپٹے نے مجھے

ٹھنڈ سے بچایا تھا۔ اسی تکونے طاق پر جلتے ہوئے ننھے سے دیے نے مجھے روشنی عطا کی تھی۔ نہیں دیواروں کے سائے میں، اسی چارپائی پر بیٹھ کر میں اپنا ہوم ورک کیا کرتا تھا۔ اسی چارپائی پر بیٹھ کر پھوپھی اماں میرے بال سنوارا کرتی تھیں، اسکول کے لئے تیار کیا کرتی تھیں اور کریم چچا میرے لئے دودھ کا گلاس لے کر کھڑے رہا کرتے تھے۔ ہزاروں تکلیفیں اٹھا کر بھی پھوپھی اماں مجھے دودھ دینا نہیں بھولتی تھیں۔ حالاں کہ وہ خود اپنے وضو کے پانی سے سینچے ہوئے ساگ اور روٹی پیاز کھا کر گزارا کرتی تھیں، تب یہ باتیں مجھے سمجھ میں نہیں آتی تھیں، لیکن جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی معاملات میرے سمجھ میں آتے گئے۔ اس بھری پری دنیا میں نہ میرا کوئی اور سہارا تھا نہ پھوپھی اماں کا۔ ننھی سی عمر میں ہی جب ظالموں کے ہاتھوں ہمارا گھر راکھ راکھ ہوگیا تھا، تب میری محروم یتیمی نے پھوپھی ماں کے آنچل میں ہی پناہ پائی تھی، پھوپھی اماں بہت خوبصورت تھیں۔ دادا میاں نے بڑے پیار سے ان کا نام ماہ نور رکھا تھا اور اپنی ٹوٹتی سانسوں کے بیچ نو ہی سال کی عمر میں ٹھیکرے کی مانگ پر اپنی بہن کے گیارہ سالہ بیٹے کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا تھا۔ بچہ بہت پیارا اور بے حد ذہین تھا، لہٰذا اسے پڑھائی کے لئے شہر بھیج دیا گیا۔ اس سال میٹرک میں اس نے ٹاپ کیا۔ اس خوشی میں پکنک کا پروگرام بنا۔ اسکول بس بچوں کو لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔

اچانک ہی طوفان آ گیا۔ چاروں طرف کہرے کی چادر پھیل گئی۔ پھر کہیں کچھ نہ بچا۔ اب ماہ نور خانم کا نہ منگیتر بچا تھا نہ سسرال، گڑیوں کا بیاہ رچانے والی منّو خود سفید چادر میں لپٹ گئی، پھر ٹوٹے ڈھبے اس گھر کو منّو نے اپنے ہاتھوں سے لیپ پوت کر کھڑا کیا اور ہم اس گھر میں آ بسے۔ پھوپھی اماں، میں اور کریم چچا دادا ابا کے زمانے کے پرانے ملازم، تب یہ بھی چھوٹے تھے اور آج جب میں جوان ہو چکا ہوں تب بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے پھوپھی اماں کو بھی گود کھلایا تھا اور مجھے بھی۔

جب تک ہاتھوں میں طاقت تھی انہوں نے محنت مزدوری کر کے اپنا گزر بسر کیا

۔ پھوپھی نے سلائی کڑھائی کر کے مجھے پروان چڑھایا۔ پھوپھی نے خود کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا، بلکہ سب کو دیتی رہیں، اپنی محبت، اپنی شفقت، اپنا پیار، اپنی خدمت۔ میری زندگی سنوارنے کے لئے پھوپھی اماں نے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ دن رت محنت کی، دیے کی دھندلی روشنی میں بیل بوٹے کاڑھے، اڑوس پڑوس کے دھان کوٹے، چاول چھانٹے۔ مجھے بنانے کے لئے کھویا ہوا سب کچھ پانے کے لئے اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں گھٹے اگا لئے، دھان کوٹتے کوٹتے پیروں میں چھالے ڈالے اور مجھے ننھے سے پودے سے ایک تناور درخت کی شکل میں بدل دیا۔

میں نے اعلی کامیابی حاصل کی۔ مجھے اسکالرشپ ملی اور اونچی تعلیم کے لئے فارن بھیج دیا گیا، لیکن جیسے جیسے میرے قدم آگے بڑھتے گئے، چکا چوندھ کی اس دنیا سے میرا ناطہ گہرا ہوتا گیا اور اپنی پناہ گاہ کو، پھوپھی اماں کی قربانیوں کو، کریم چچا کے پیار کو بھولتا چلا گیا۔ ایم بی اے کرتے کرتے مجھے وہیں ایک جاب کا آفر ملا اور پھر میرے پنکھ لگ گئے۔ میں محو پرواز ہو گیا۔ اونچا اور اونچا اور میں سب کچھ بھولتا چلا گیا مگر پھوپھی اماں مجھے نہیں بھولیں۔

میرے آس پاس کے کچھ اور لڑکے بھی وہیں کسی نہ کسی کام میں لگے ہوئے تھے۔ یہہ کوئی نئی بات نہیں تھی، سو ایسے ہی کئی لوگ برابر آتے جاتے رہتے تھے اور ان کے ہاتھوں ہر سال عید کے موقع پر پھوپھی اماں ایک لفافے میں بند کر کے عیدی کے پانچ روپے بھیجا کرتی تھیں، ہزاروں دعاؤں کے ساتھ، کبھی یہی پانچ روپے میرے ئے کروڑوں کی دولت سے بڑھ کر ہوا کرتے تھے، لیکن اب مجھے وہ تو خانم کی اس بے وقوفی پر ہنسی آنے لگی تھی، لیکن یہ پانچ روپے بھی کہاں سے آتے ہیں، میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔

ادھر کچھ دنوں سے مجھے ان کی یاد آ رہی تھی اور میں اچانک ان کے سامنے جا کر انہیں چونکا دینا چاہتا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے آنے جانے والوں سے بھی میرا

رابطہ ٹوٹا ہوا تھا کیوں کہ اب میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہو کر ایک بڑے سے فلیٹ میں رہتا تھا اور وہ لوگ آج بھی محنت و مزدوری کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کمروں میں اپنی راتیں بسر کر رہے تھے۔

کئی دنوں کی کوشش کے بعد دو دن پہلے میرے تمام کاغذات مکمل ہو گئے اور پھر چوبیس گھنٹے کا سفر طے کر کے اسی دہلیز پر آ کھڑا ہوا ہوں، جس کی کچی زمین پر جب برسات کی پہلی بارش ہوا کرتی تھی تو سارا ماحول سوندھی سوندھی مہک سے معطر ہو جایا کرتا تھا اور میرے ننھے ننھے پیر آنگن کی زمین پر اپنے نشان بنایا کرتے تھے اور میں اپنے ننھے ہاتھوں سے مٹی کے گھروندے بنایا کرتا تھا، پھر مٹی میں لپٹے ہاتھ پیروں سمیت کریم چاچا کی گود میں چڑھ جایا کرتا تھا اور کریم چاچا کی جھوٹی ڈانٹ سن کر پھوپھی کے آنچل میں منہ چھپا کر مسکراتا رہتا تھا۔

"ہم تو پڑھے لکھے نہیں ہیں بوا۔ نہ ہمیں تمہارا پتہ معلوم تھا کہ کسی اور سے تمہیں چھٹی لکھوا دیتا۔ پر تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ کئی سالوں سے کوئی سدھ ہی نہ لی۔ بہت یاد کرتی تھیں بڑو تمہیں، کئی مہینوں سے بڑی تکلیف میں بسر ہو رہی تھی۔ ہم بھی بہت بیمار رہے۔ اب ہاتھ پیر نہیں چلتے، لاٹھی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ سوائے بڑو کے اور تمہارے سوا میرا تھا ہی کون؟ جب بڑو بھی ہم کو چھوڑ گئی تو ہم بالکل ہی ٹوٹ گئے۔ اب کہیں کچھ نہیں رہا بوا۔ کاش......"

اب رات نے اپنا آنچل پھیلا دیا ہے۔ دور دور تک سناٹے کی چادر تن گئی ہے اس سناٹے کے عالم میں صرف ایک آواز ہے، کریم خاں کی سسکیوں کی آواز، وہ کھری چارپائی کے پائتانے سر نگائے کچی مٹی کی زمین پر بیٹھے مسلسل روئے جا رہے ہیں۔

میرے سامنے پڑی چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہونا چاہتا ہوں مگر اٹھ نہیں پاتا۔ خود لاٹھی کا سہارا لئے ہوئے کریم چچا نے میرا ہاتھ تھام کر

مجھے کھڑا کر دیا ہے۔ان کی انگلی تھامے تھامے میں نے ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے قدم دھیرے دھیرے قبرستان کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے تمام چیزیں بے معنی ہوگئی ہیں۔روپیہ پیسہ دولت شہرت سب کچھ اور میں خود کو ستائیس سال پہلے کا وہی ننھا سا بچہ محسوس کر رہا ہوں، جو کریم خان کی انگلی پکڑ کر کچی پکی سڑکوں پر ڈگر مگر چلا کرتا تھا۔

اسکول کھلا رکھو!

باہر سے ایک عورت کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر میں جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت میں اپنے ایچ ایم کا بتایا ہوا کام کر رہا تھا۔ ہیڈ مسٹریس نے اپنا اٹینڈینس بنانے کے بعد مجھے یہ رجسٹر سونپا تھا۔

''ہم دو گھنٹے کے لئے باہر جا رہے ہیں، ہمارے آنے تک آپ اسے مکمل کر لیجئے گا اور جیسا کہا ہے ویسا ہی کیجئے گا، اس میں کوئی گڑبڑی نہیں ہونی چاہئے''۔

میں اس سرکاری مڈل اسکول میں ایک کلرک ہوں۔ میری سبک دوشی میں اب سال بھر ہی باقی رہ گیا ہے۔ جب میرا تبادلہ اس اسکول میں ہوا تھا تو شروع شروع میں مجھے یہاں کی روٹین کچھ اوٹ پٹانگ سی لگی تھی، مثلاً کسی ایک ٹیچر کو کئی کلاسوں کی ذمہ داری دے کر باقیوں کے ساتھ ایچ ایم کا گپیں مارنا۔ اسکول میں اگر دو سو بچے آئے ہیں تو تین سو کی حاضری بنانا وغیرہ وغیرہ، مگر دھیرے دھیرے سارے معاملات میری سمجھ میں آ گئے تھے۔ ہفتے میں ایک دن بچوں کو کیلے، سنترے یا انڈے دینے کا مینو سرکار کی طرف سے بنا تھا۔ آج ہفتے کا ہی دن تھا۔ ایچ ایم نے کل تین سو کیلے کا بل بنانے کو کہا تھا، جب کہ حاضری کھاتے میں دو ہی سو بچوں کے نام تھے۔

ان دنوں میں اسکول میں ایک نئی میڈم کی بحالی ہوئی ہے۔ سنتے ہیں کہ ان کے ابا بڑے ایماندار آدمی تھے۔ شاید ان میڈم کو بھی باپ والا روگ لگ گیا تھا تبھی تو

وہ ہیڈ ماسٹر سے پوچھ بیٹھی:

''میڈم! یونیفارم کی جو سٹ بنی ہے وہ تین سو یونیفارم کے لئے ہے جب کہ یونیفارم کے حق دار بچے تو یہاں دو ہی سو ہیں۔ باقی یونیفارم کا کیا کرنا ہے؟''

''کیا کرنا ہے سے آپ کو کیا مطلب؟ آپ کو جو کہا گیا، کرپا کر کے اتنا ہی کریں۔''

یہ نکا سا جواب سن کر نئی میڈم نے پھر کوئی سوال نہ کیا، لیکن نئی میڈم کے دماغ میں خیالوں کے طوفان امڈ گھمو کر رہے تھے۔ قیمت فی یونیفارم پانچ سو روپے۔ فاضل سو یونیفارم تو یہ فاضل پیسے کن کن کی جیبوں میں جائیں گے؟

اپنی کلاس کی طرف جاتے ہوئے نئی میڈم نے دیکھا کہ ایچ ایم اپنی کرسی پر براجمان ہیں اور ان کے چاروں طرف رسوخ دار پیرا ٹیچروں کی محفل جمی ہوئی ہے۔ ایک پارا ٹیچر ان کے چہرے پر فیشیل کر رہی ہے، دوسری ان کے ہاتھوں میں مہندی رچا رہی ہے۔

پرمیلا میڈم کو کھچڑی کے لئے چاول لانے کی ڈیوٹی دی گئی ہے۔ وہ ایک لڑکے کو لے کر چاول لانے چلی گئیں۔ ایک تھیلا بھی رکھ لیا ہے۔ نئی میڈم کو ان سب کلاسیں کمبائنڈ کرنے کا حکم سنا کر ایچ ایم صاحبہ گیٹ پر چلی گئیں۔

''کیلے آ گئے؟''

''یس میڈم! ڈیڑھ سو کہا تھا نا؟''

''ہاں! دو کیلے تم بھی کھا لو۔''

''تھینک یو میڈم!''

غریب لڑکا احسان مندی سے سر جھکا کر بولا:

''اور دیکھو، جیسا کہا ہے ویسا ہی کرنا!''

''یس میم!''

گیٹ کے کونے پر ایچ ایم کے Husband بائک اور تھیلا لئے، منھ گھمائے کھڑے تھے۔

''لیجئے، پچاس عدد تھیلے میں ڈال لیجئے''۔

پچاس کیلے آن کی آن میں ہیڈ میڈم (ایچ ایم) کے گھر پہونچ گئے! باقی بچے کیلے کے ٹکڑے بنا کر ایک ایک ٹکڑا بچوں کو دے دیا، اڑتیس عدد بچے جو میڈ مول میں بنٹے۔

''چلو بھئی، اب ہم کو بھوک لگ رہی ہے۔''

''شوبی میم! آپ کیلا کھائیں؟''

''نو میم، تھینکس!''

''ارے یہ شوبی کیا کھائے گی۔ اس کے ماں باپ نے کھانا سکھایا ہی نہیں۔ لا شوبی! اپنا حصہ تو مجھے دے دے!''

نئی میڈم شوبی سے اس کا حصہ مانگ کر کھانے والی یہ میڈم بڑی پیٹو اور چٹوری قسم کی ہیں۔ شوبی کا لنچ ڈبہ اکثر یہی موٹی میڈم خالی کر دیتی ہیں اور یہ بے چاری بھوکی رہ کر کمبائنڈ کلاس لیتی رہتی ہے اور گھر پہونچتے ہی بے دم، بے سدھ بستر پر گر جاتی ہے۔

پرمیلا میڈم نے چاول کے بورے میں سے پانچ کلو چاول نکال کر اپنے تھیلے میں رکھ لئے ہیں اور ادھر ادھر دیکھ رہی ہیں کہ پڑوس کا کوئی بچہ نظر آئے تو اس تھیلے کو اپنے گھر بھجوائیں۔

کھچڑی پکانے والیاں پہلے سے چولہا جلا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایچ ایم نے میڈم شوبی سے پچیس روپے ادھار مانگ کر آج کھانا بنانے کے لئے کوئلہ خریدا تھا۔ شوبی سے وہ کئی بار ادھار لے چکی ہیں۔ یہ ادھار کبھی واپس نہیں ہوتے۔

کھچڑی پک کر تیار ہوئی تو بچوں کا لنچ بریک لگ بھگ ختم ہونے کو تھا۔ بچوں

کو پیچھے ڈھکیلتی ہوئی پیرا ٹیچرز نے اپنی پٹی تھالیاں آگے کر دیں۔ بچے انتظار میں کھڑے تھے۔ لنچ کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ پیرا ٹیچرز اپنی اپنی تھالیں سنبھالے اپنی خاص جگہ میں جا بیٹھی تھیں۔ ایچ ایم نے نئی میڈم کو آرڈر دیا:

''بچوں کو سنبھالئے میڈم! ہاتھ باندھ کر کھڑے رہنے سے کام نہیں بنے گا۔ نہیں کھلا کر جلدی اپنی کلاس میں چلی جائیے۔''

اب کھچڑی پکانے والیوں کی باری تھی۔ پہلے اپنی پلیٹیں بھر لیں پھر بچوں کو دیا۔

''کھا دیجئے نا''

ایک پانچ سال کا بچہ یہ کہتا ہوا آگے آگیا۔ کھچڑی پکانی والی جھنجھلا اٹھی اور اس نے گرم گرم کھچڑی کا کرچھل اتنے زور سے بچے کے پلیٹ پر ماری کہ پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور کھچڑی اس معصوم بچے کے سینے پر۔ بچہ جلن کے مارے تڑپ اٹھا۔

نئی میڈم کے لئے یہ نظارہ ناقابل برداشت تھا۔ ان کا جی چاہا کہ کھچڑی کی پوری ہانڈی پکانے والی کے منھ پر الٹ دے۔ ادھر ایچ ایم چلا رہی تھیں:

''جلدی کیجئے میڈم! آپ کی کلاس سفر کر رہی ہے۔''

نئی میڈم نے اس ننھے معصوم کی شرٹ صاف کی۔ اس کے سینے پر مرہم لگایا۔ اپنے بیگ میں پڑی دو ٹافیاں بچے کو دیں اور اپنی کلاس میں چلی آئیں جب کہ ان کا لیزر پیریڈ تھا، لیکن انہیں آج تک لیزر نہیں ملا تھا، ہر لیزر میں انہیں کسی نہ کسی کلاس کا ذمہ تھوپ دیا جاتا تھا۔

لنچ کا وقت ختم ہو چکا تھا، سامنے ٹیبل پر ان کا لنچ باکس خالی پڑا تھا۔ سینئر موٹی میڈم ابھی تک زبان چٹپٹا رہی تھیں۔

''تو ادھر کھچڑی پکانے والیوں کی طرف چلی گئی شوبی! مجھے ہاتھ کے بنے پراٹھے دیکھ کر میں خود کو روک ہی نہیں پاتی۔ واہ! کیا ٹیسٹی پراٹھے بنتی ہیں تیری ممی!

میں تو اپنا ٹفن لا نہیں پاتی ۔ لے! ایک کھجور پڑی ہے میری بیگ میں، اسے تو کھا لے، کالی کھجور ہے، مدینہ منورہ کی، بڑی مہنگی ملتی ہے۔''

''بڑی مہنگی ملتی ہے۔'' جملے پر زیادہ زور دیتی ہیں موٹی میڈم ۔ یہ بڑی مہنگی اور مقدس کھجوریں موٹی میڈم کے میاں حج سے واپسی پر لائے ہیں۔ تبرکاً تقسیم کرتی پھرتی ہیں۔ احسان جتاتی ہوئی، سناتی پھرتی ہیں:

''میرے میاں کی ہڈی ماشاءاللہ بہت مضبوط ہے، ریٹائرمنٹ کے کئی سال بعد بھی سٹھے، پٹھے! میں کون سی کم ہوں، ادھر بیٹھی ادھر اڑی۔''

مطلب اب تو ریٹائر ہونے والی ہوں نا، میں جنگ میں بھی فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے پرواز کر جاؤں گی بلا تاخیر۔

دراصل نئی میڈم (میڈم شوبی) کبھی موٹی میڈم کی اسٹوڈنٹ رہ چکی تھیں، اس لئے وہ اپنا بڑپن جتاتے ہوئے تو تراق سے ہی ان سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ کل کی ان کے سامنے کی بچی شوبی اب ان کے برابر آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ شوبی کو یہ بھی پتہ تھا کہ یحیم شحیم یہ موٹی میڈم انگلش کس حد تک جانتی ہیں۔ English Speaking Course پڑھ پڑھ کر اٹی سٹی انگریزی بولنا تو سیکھ گئی تھیں، پر بچوں کو پڑھانے سمجھانے کی بات جہاں آتی وہ انہیں ڈفر کے خطاب سے نواز کر اپنا دامن چھڑا لیا کرتی تھیں۔

چار بجنے کو تھے۔ کئی ٹیچر کسی نہ کسی بہانے سے گھنٹے بھر پہلے ہی اسکول سے غائب ہو چکے تھے، میں نے بھی اپنا بیگ سنبھال لیا تھا۔ شوبی میڈم کو ابھی کچھ اور کام نپٹانے تھے۔

آج مجھے گھر پہونچنے کی جلدی تھی، میرے نواسے کا برتھ ڈے جو تھا۔ کل سے تین دنوں تک اسکول میں چھٹی رہے گی۔

باہری گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میری نظر اس عورت پر پڑی جو اب تک

وہاں بیٹھی بین کر رہی تھی۔ آنسو بھری آنکھوں اور گول مٹول چہرے والا پانچ چھ سال کا ایک بچہ اس کی پیٹھ پکڑے کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ عورت اٹھ کر کھڑی ہوگئی

''ہاتھ جوڑتے ہیں صاحب، ہم آپ کے پاؤں پڑتے ہیں .... اسکول بند مت کرو!''

''ارے! کیا بک رہی ہے تو؟ اسکول ہم بند کرواتے ہیں؟ یہ تو سرکاری حکم ہے۔ چناؤ ہونے ہیں۔ یہاں اس اسکول میں مشینیں آئیں گی، ووٹ ڈالے جائیں گے، پر تمہاری کیا پریشانی ہے؟ اسکول بند ہو کہ کھلا، تمہیں اس سے مطلب؟''

''مطلب ہے ناصاب! ہم کو سکول سے مطلب ہے، چناؤ سے نہیں۔ کرسی پر کوئی بیٹھے، ہم تو بھوئیں (زمین ہی) پر بیٹھیں گے نا! ہم تو کچرا چن چن کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ آج بھی کچرا، کل بھی کچرا اور او (وہ) سالا میرا مرد، اس چھوکرے کا باپ، دارو پی کر پڑا رہتا ہے .... او تو اس کو اسکول بھیجنا ہی نہیں چاہتا، بھیک مانگ کر پیسے لانے کو کہتا ہے۔ بولتا ہے ....   تو اسکول جا کر کھانا کھالے گا، پر ہم؟ ہم دارو کہاں سے لائیں گے؟ پیسے مانگ کر لائے گا، ایک بوتل دارو تو مل جائے گی، پر صاحب ہم ایسا نہیں چاہتے۔ اسکول آئے گا تو روکھا چاہے سوکھا ایک ٹیم ہمرے بچے کے پیٹ کو اناج تو مل جائے گا۔ اسکول بند ہوگیا تو ہمرا (ہمارا) بچہ کھائے گا کیا؟ آپ ہی بولو نہ صاب، بولتے کاہے نہیں؟''

مجھ سے کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔

تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف لپکتے ہوئے اپنے بیگ میں رکھے بڑے سے کیڈبیری سیلبریشن پیک کو ٹٹولتا ہوں کہ اتنی دیر میں کہیں، وہ پگھل نہ گیا ہو۔

☆☆☆

ایک سلائس بریڈ

ہوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے باہر آ کر ٹیکسی والے سے پارک اسٹریٹ جانے کے لئے بات کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

''صاحب، او صاحب او بلو شرٹ والے صاحب، ذرا سنئے گا۔'' میں نے اپنے آس پاس دیکھا لوگوں کی لمبی قطار میں اس وقت بلو شرٹ صرف میرے ہی جسم پر تھی۔

آواز کی طرف متوجہ ہونے پر مجھے پتہ چلا کہ یہ لوگ مجھے ہی پکار رہے ہیں۔ سامنے سے دس گیارہ سال کے دو بچے ایک کیری بیگ سنبھالے میری ہی طرف چلے آ رہے تھے: ''صاحب یہ سامان وہاں گر گیا تھا۔''

بھولی صورت اور معصوم آنکھوں والے دو بچے۔ ایک ٹرانسپورٹ کیری بیگ، اس میں سے جھانکتے خوبصورت کھلونے، ٹافیاں اور چاکلیٹ کے پیکٹ کسی بھی بچے کا جی للچانے کے لئے کافی تھا۔

کھلونوں سے بھرا کمرہ، چاکلیٹ، ٹافیاں ان ہی چیزوں کو تو بچے اپنی میراث سمجھتے ہیں۔ یہ کھلونے وغیرہ اس نے اکبر کے بچوں کے لئے خریدے تھے۔ میرے دکھ سکھ کا ساتھی اکبر جو پارک اسٹریٹ میں دو کمروں کے خوبصورت فلیٹ میں اپنی امی، بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ چمڑے کی ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ مزدور کی حیثیت سے بحال ہوا تھا اور اب منیجر کے پوسٹ پر آ گیا ہے۔ میں نے

جان بوجھ کر سے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ اچانک پہونچ ک. سے چونکانا چاہتا تھا، اسی لئے پلین سے ممبئی تک آنے کے بعد میں نے ٹرین کے سفر کو پسند کیا۔ بنگال کی ہریالی کو دیکھتے ہوئے اور یہاں کی ہواؤں کی خوشبو کو نتھنوں کے راستے دل تک پہونچاتے اور محسوس کرتے ہوئے سفر کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بنگال کی سرحد پر قدم رکھتے ہی جیسے میری دنیا بدل جاتی ہے آج پورے سات سال بعد جرمنی سے لوٹ رہا ہوں اور اتنے سالوں میں ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا جب مجھے کلکتے کی گلیاں یاد نہ آئی ہوں۔ یہ گلیاں، یہ سڑکیں جہاں میرا بچپن گزرا تھا اور جس نے مجھے اکبر جیسا دوست دیا تھا۔ دس سال کی عمر میں جب میں اپنے والدین کے ایک حادثے کا شکار ہو جانے کے بعد رشتہ داروں کے طعنے سے تنگ آکر پٹنہ شہر چھوڑ کر کلکتہ بھاگ آیا تھا تو ان ہی گلیوں نے مجھے پناہ دی تھی۔ راہ چلتے اکبر جیسا دوست عطا کیا تھا۔

اکبرا اپنے پرانے کوٹ کی جیب میں اپنے حصے کی روٹیاں چھپا کر میرے پاس چلا آتا تھا پھر ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ میں رات کو کسی دکان کے شیڈ کے نیچے یا کسی ڈھابے کے باہر پڑی بینچ پر سو جاتا تھا۔ ان دنوں گرمیوں کا موسم تھا، اس لئے وقت نہیں ہوتی تھی، مجھے پٹنہ سے بھاگے ڈھائی مہینے ہو گئے تھے ،مگر کسی بھی رشتے دار نے مجھے تلاشنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے سامنے والے چائے خانے کے مالک سے بات بھی کی تھی کہ وہ مجھے کام دلا دیں آخر اکبر کی روٹی کب تک کھاتا رہتا۔ اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ وہ پوری کوشش کرے گا۔

اسی بیچ جولائی کا مہینہ آ گیا۔ رم جھم بارش شروع ہوئی تو ایک دن ڈھابے کے سامنے پڑی بینچ پر بیٹھے اکبر نے پوچھا:

''تو اب کہاں سوئے گا جی؟''

''تیرے ساتھ اور کہاں؟'' پیچھے سے ایک آواز آئی تو ہم دونوں

چونک کر کھڑے ہوگئے۔

''امی آپ؟'' اکبر کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

''آپ کو کیسے؟''

''ماں کو اپنے بیٹے کے معمولات کی فکر نہ ہو تو ماں کیسی؟ میں نے تو شروع کے دو چار دنوں کے اندر ہی سب پتہ کرلیا تھا، جب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا بیٹا کوئی غلط نہیں کر رہا ہے تو میں نے روٹی کی ڈبیہ میں دو کی بجائے چار روٹیاں رکھنی شروع کردیں اور اب تک تم کو پتہ نہیں چلا کہ دو ہی روٹیوں میں دو لوگوں کا پیٹ کیسے بھر جاتا ہے۔''

ماں ہنس دیں، اماں کی ہنسی بڑی پیاری تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔

یہ جوڑ چوکور کھپریلوں والا ایک گھر تھا ایک آنگن، آنگن میں ہینڈ پمپ کے پاس ہی امرود کا پیڑ، اس کی موٹی ڈالیوں میں رسیوں کا بنا ایک جھولا۔ آنگن کے چاروں طرف کمرے، ہر کمرے سے لگا یک چھوٹا سا دالان جو باورچی خانے کا کام بھی دیتا تھا، اس کی دیوار میں ریک بنے ہوئے تھے۔ جس پر برتن، چاول، چنے، مسالے وغیرہ کے ڈبے سجے ہوئے تھے۔ ریک کے نیچے چولہا رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ جہاں اماں کھانا پکاتی تھیں۔ پکانے کے بعد دالان کی صفائی کرتی تھیں اور چٹائی بچھا کر صبح شام از دس پڑوس کی بچیوں کو اردو عربی پڑھاتی تھیں۔ پھر دوپہر کے دو بجے سے چار بجے شام تک انہیں سلائی بنائی سکھاتی تھیں۔ عصر کے بعد شام کے کام میں لگ جاتی تھیں۔

جلد ہی اکبر کے ساتھ اکبر کے اسکول میں چھٹی کلاس میں میرا داخلہ بھی ہوگیا۔ میری زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ اماں کا پیار پاکر میں اپنے سارے دکھ، رشتے داروں کی بے رخی، بے وفائی، بے مروتی، دھوکے بازی

،سب بھول گیا۔ اماں ہر نماز کے بعد ہماری کامیابی کی دعائیں مانگتیں ۔ ہر جمعرات کو سید بابا کی مزار پر حاضری بھی دیا کرتیں۔ اپنے بیٹے اکبر سے بھی زیدہ انہیں میری فکر رہا کرتی تھی ۔ پھر ہمارے امتحانوں کے دن آگئے اور ہم جی جان سے پڑھائی میں لگ گئے ۔

اماں راتوں کو جاگ جاگ کر ہمارے لئے چائے بنایا کرتیں کھانے کو اپنے بوتے پر اچھی اچھی چیزیں بنا کر کھلایا کرتیں جب میٹرک کے ریزلٹ آئے تو میں نے ٹاپ کیا۔ اکبر بھی بہت اچھے نمبر لایا۔ اماں کی خوشی کا یارانہ رہا۔ سید بابا کے مزار پر چادر پوشی کے بعد پورے محلے میں مٹھائی بانٹی تھی انہوں نے ۔

اب ہم دونوں نے مل کر سوچنا شروع کیا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی پارٹ ٹائم جاب کرنا چاہئے تا کہ اماں کا بوجھ ہلکا ہو سکے ۔ کچھ ہی دنوں کی کوشش کے بعد مجھے ایک ہوٹل میں ویٹر کی نوکری مل گئی اور اکبر کو اس کے محلے کے ایک بزرگ نے چمڑے کی فیکٹری میں کام دلوادیا۔

اب ہم دونوں کی راہیں الگ ہوگئی تھیں، ہم دونوں الگ الگ سمتوں سے رات گئے گھر لوٹتے۔ امی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھاتے اور سو جاتے ۔ گرچہ ہمارا ساتھ ان دنوں مختصر ہو گیا تھا، لیکن ہم الگ نہیں تھے، صبح کام پر جانے سے پہلے امی کی دعائیں ایک ساتھ لیا کرتے تھے۔ باہر آ کر ہماری سمتیں بدل جاتی تھیں ۔

ان ہی دنوں جرمنی سے مارٹن صاحب کا آنا ہوا، وہ بھارت درشن پر آئے تھے۔ انہیں سادہ ہندوستانی کھانا پسند تھا اور وہ بھارتیہ ساہتیہ اور سنسکرتی پر ریسرچ کر رہے تھے۔ ہندی کے علاوہ اردو فارسی اور عربی پر بھی انہیں قدرت حاصل تھی ۔ ہمارا چھوٹا سا ہوٹل انہیں ایسا بھایا کہ وہ ہر روز ہمارے یہاں کھانا کھانے لگے ۔ دھیرے دھیرے ہماری پہچان بڑھتی گئی ۔ وہ ہر روز مجھ سے میرے بارے میں باتیں کرنے لگے میرے سارے حالات رفتہ رفتہ ان پر عیاں ہو گئے۔

پورے تین ماہ وہ یہاں رہ گئے تھے پھر ایک رات جرمنی لوٹنے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر بیٹھنے کو کہا۔ میں گھبرا گیا ''سر ابھی تو میرا کام ختم نہیں ہوا۔ لوگ آئیں گے تو ....؟ میری چھٹی کا وقت نہیں ہوا ہے۔''

''معلوم ہے، لیکن میں تمہارے مالک سے بات کر چکا ہوں۔''

''لیکن بات کیا ہے سر؟''

''بات یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' تم ہاں کہہ دو تو میں تمہاری امی سے بات کرلوں گا، باقی سب ہو چکا ہے۔ ان تین مہینوں میں میں نے تمہارے بارے میں بہت سوچا ہے۔ تمہاری صلاحیت اور ایمانداری کو پرکھا ہے۔ وہاں جرمنی میں میرا ابھی ایک تھری اسٹار ہوٹل ہے، میں تمہیں اپنا وارث بنانا چاہتا ہوں، وہاں تم ویٹر کی نہیں منیجر کی حیثیت سے پوسٹیڈ ہوگے۔ تمہاری تعلیم بھی جاری رہے گی۔ بزنس میں اب میرا جی نہیں لگتا میں سکون کے ساتھ اپنے تخلیقی کام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پورا بھارت ڈسکور کرنا ہے۔ میرا سارا بزنس اب تم ہی سنبھالو گے۔ تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اپنی پالنے والی ماں، اپنے دوست اکبر اور جس کے لئے بھی جو چاہو کر سکتے ہو۔''

مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک دن میری قسمت ایسے پلٹ جائے گی، لیکن امی کی مہربان آنکھوں کی شفقت، اکبر کی محبت یہ سب بھولنا میرے لئے بہت مشکل تھا، مارٹن صاحب نے یقین دلا:

''اب دوری کہیں نہیں ہے، آپ لوگ جب چاہیں ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، آمنے سامنے باتیں کر سکتے ہیں۔''

مارٹن صاحب نے اپنے تمام وعدے پورے کئے، زندگی مزے سے گزرنے لگی۔ کام کے ساتھ میری تعلیم بھی جاری رہی۔ پڑھائی اور کام کے بعد ہر رات امی اور اکبر سے باتیں بھی ہوتی رہیں۔ فرصت کے وقت مارٹن صاحب کی

تخلیقات کی فیر کاپی بنانا بھی میں نے اپنے معمول میں شامل کرلیا۔ان کی تخلیقات کے ذریعے میری معلومات بھی بڑھتی رہیں۔اس بیچ اکبر کی بھی ترقی ہوگئی تھی اور وہ ٹالی کھولا والے اس گھر سے نکل کر پارک اسٹریٹ میں دو کمروں کے ایک خوبصورت فلیٹ میں امی، دلہن اور بچوں کے ساتھ شفٹ ہوگیا تھا۔مارٹن صاحب کی ایک کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آگئی تھی اور کافی مقبولیت پا رہی تھی۔ وہ دوسری کتاب لکھنے میں مصروف ہوگئے تھے، مگر اب ن کے قلم کی روانی کچھ کم ہوگئی تھی۔ ہاتھ ذرا ذرا کانپنے لگے تھے، لیکن خیالوں کی اڑان بہت اونچی تھی۔ آنکھیں دھندلی، مگر دل روشن تھا۔

ان دنوں کلکتہ کی یاد بہت آرہی تھی۔ اتنی ترقی حاصل ہو جانے کے باوجود میرا دل کلکتے کی گلیوں میں بھٹکتا تھا۔ان گلیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھ، جنہوں نے میرے بھٹکتے ہوئے بچپن کو پناہ دی تھی، مگر مارٹن صاحب کی طبیعت کا خیال کرتے ہوئے میں نے اپنے دل کی کیفیت ان پر ظاہر نہیں کی تھی۔ایک شام ناشتے کی میز پر چائے کی چسکیاں لیتے لیتے اچانک انہوں نے پوچھا:

''تم کلکتہ جانا چاہتے ہو جی؟''

''جی .... مگر میں نے ایسا کچھ تو نہیں ....''

میں ذرا ہڑ بڑا گیا۔'' کچھ بے چین سے نظر آتے ہو۔ بہت دن ہو بھی گئے ہیں۔سنو . تم کلکتہ ہو آؤ اور اب میں ایسا نظام کر رہا ہوں جس کے ذریعے ہر تین چار مہینے پر تم وہاں آتے جاتے رہو گے اپنے لوگوں سے ملتے رہو گے۔'' میری آنکھیں بھر آئیں اپنے محسن کے اتنے سارے احسانوں کا بدلہ کیا کبھی چکا سکوں گا؟

کلکتے میں تین مہینے ایسے گزر گئے جیسے تین دن بیتے ہوں، اس بیچ میں ان گلیوں میں بھی گھوما اپنے پرانے ملک سے بھی ملا۔امی کی شفقت، اکبر کی محبت، اس کے بچوں کی معصومیت سے سیراب ہوا اور پھر میری واپسی کا دن بھی آگیا۔اس بیچ میں دو تین بار ان دونوں بچوں سے بھی ملا تھا، ان کے مستقبل کے متعلق ایک فیصلہ بھی

لیا تھا، جس طرح مارٹن صاحب میرا سہارا بنے تھے، میں بھی ان دونوں کا سہارا بنوں گا، انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، لیکن شاید میری سوچ میں کچھ کمی رہ گئی تھی کہ مارٹن صاحب کی طرح فوراً ہی عمل پیرا نہ ہو کر اگلی ٹرپ یعنی تین مہینے بعد پر یہ معاملہ چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ گرچہ لوٹتے وقت ان کی ضرورت کی بہت سی چیزیں اور کچھ رقم بھی دے آیا تھا۔ انہوں نے خوشی خوشی مجھے رخصت کیا تھا، مگر ان کی آنکھیں چھلکی چھلکی سی تھیں:

''آپ نے ہمیں بہت پیار دیا ہے صاحب، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔''

ادھر میرے پیچھے مارٹن صاحب کچھ زیادہ ہی کمزور ہو گئے تھے۔ میں ان کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ انہیں علاج کی سخت ضرورت تھی، میری ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ اس طرح تین مہینے پورے نو مہینوں میں بدل گئے۔

آج پورے دس ماہ بعد میں پھر ہوڑہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں۔ پلیٹ فارم کے سامنے گول چبوترے کے بیچ کھڑا نیم کا پیڑ اداس لگ رہا ہے۔ اس کے نیچے کی جگہ خالی خالی سی لگ رہی ہے۔

ایک بوڑھا فقیر لاٹھی ٹیکتا دھیرے دھیرے میری طرف چلا آ رہا ہے۔'' ٹرین بہت پہلے واپس جا چکی۔ اب تک یہیں کھڑے ہو؟ کسی کو ڈھونڈ رہے ہو صاحب؟''

فقیر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''آں .... ہاں! وہ میں، وہاں جو دو بچے ......''

انگلی سے اشارہ کر کے میں نے اس نیم کے پیڑ کی طرف دیکھا۔'' آپ وہی صاحب ہیں جنہوں نے انہیں اپنے ساتھ؟''

''ہاں بابا، مگر وہ کہاں؟ کیا نہیں کوئی ....؟''

''بڑی دیر کر دی صاحب، بہت انتظار کیا تھا انہوں نے، آپ کے دیئے

پیسے بہت سنبھال کر خرچ تھے، مگر ایک رات کوئی ظالم ان کی ساری پونجی اڑا لے گیا۔ وہ بھوکوں مرنے لگے، وہ بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔ آپ ہی کہو نا۔ نہ بھیک مانگیں، نہ مزدوری کریں، تو جن کا کہیں کوئی سہارا نہ ہو وہ جئیں کیسے؟ کتنے ایسے مسیح پیدا ہوئے ہیں جو حالات کے مارے اس طرح کے لاکھوں بچوں کو گود لے لیں؟ سرکار تک بات پہونچتے پہونچتے سالوں لگ جاتے ہیں۔ سرکار ہر گلی، ہر کوچے میں جا کر ان جیسوں کو نہیں ڈھونڈھتی اور ہم جیسوں کی پہنچ نہیں۔ ہم تو ہمیشہ دھتکارے گئے ہیں۔ میرے پاس کبھی کچھ روٹیاں آ جاتی تھیں تو میں انہیں اپنے ساتھ لے لیتا تھا، پر وقت ایسا نہیں ہوتا نا، اور اس روز راجدھانی ایکسپریس کے انتظار میں ایک جوڑا فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں بیٹھا اپنے خوش آئند سفر کے متعلق باتیں کرتا اپنی دو سال کی بچی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بچی نے دودھ پی کر اپنی بوتل ایک طرف لڑھکا دی تھی اور اپنے ماں باپ کی پلیٹ سے ایک سلائس بریڈ اٹھا کر اپنی باربی ڈول کو کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ٹرین کے پلیٹ فارم پر آنے کا اعلان ہونے لگا۔ اچانک بے انتہا بھیڑ امنڈ آئی۔ سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر سامنے آ گئے تھے۔

بچی کا سلائس بینچ پر ہی چھوٹ گیا تھا، مگر رومی اور جاذو نے بچی کو ماں کے کاندھے پر سے لپکتے سلائس کے لئے ضد کرتے دیکھ لیا تھا اور وہ سلائس اٹھا کر ان کی طرف دوڑنے لگے تھے، مگر ٹرین آ کر گزر گئی۔ وہ دونوں بچی تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ لوگوں کا ایک اور جم غفیر امنڈ آیا۔ اگلی ٹرین بھی چند ہی منٹوں میں بغل والے پلیٹ فارم پر آنے والی تھی۔ سیکنڈ کلاس والوں کا ہجوم ہمیشہ فرسٹ کلاس والوں سے زیادہ ہوتا ہے، سو یہاں بھی پہلے سے دوگنی بھیڑ ہو گئی تھی۔

رومی اور جاذو ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ رومی کے ہاتھ میں ایک سلائس تھا اور دونوں کا پیٹ دو دن سے خالی، بھوک کے بگولے اٹھ رہے تھے دوسر

چکرا رہا تھا۔ اچانک بے خیالی میں یا ناقابل برداشت بھوک سے رومی کا ہاتھ اپنے منھ کی طرف اٹھ گیا۔

''مجھے بھی .... مجھے بھی'' جانو چلا کر رومی کی طرف لپکا اور اس سے پہلے کہ وہ سلائس کا ٹکرا اس سے لپک پاتا، دھڑ دھڑاتی ہوئی ٹرین آ گئی تھی۔ ہر کوئی دوسرے کو ڈھکیل کر خود آگے چڑھنے کی کوشش میں لگ گیا۔ بے تحاشہ بھیڑ سے جانو کو زور کا دھکا لگا اور وہ رومی سے جا ٹکرایا۔ دونوں کے بھوکے بچے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور سیدھے پٹری پر جا گرے۔ تب تک ٹرین اپنی رفتار پکڑ چکی تھی نفسا نفسی کے عالم میں کسی نے ان دونوں بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت رات کے ایک بج رہے تھے۔ علاقہ بھی ذرا اندھیرا سا تھا۔ اگلی ٹرین چند ہی منٹوں میں آنے والی تھی۔

سگنل مین نے لائین کلیئر ہے یا نہیں دیکھنے کے لئے سرچ لائٹ جلائی تو دیکھا پٹری پر دو ننھی لاشیں دو ٹکڑوں میں بٹی پڑی ہیں اور ایک کے کٹے ہوئے داہنے ہاتھ میں ایک سلائس اب بھی دبا ہوا ہے!''

بوڑھا فقیر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے اور میں سکتے کے عالم میں نیم کے جھڑتے ہوئے پتوں کو دیکھے جا رہا ہوں۔

☆☆☆☆☆

آرزومندی

''ای کا کرر ہا ہے شبراتی ؟ اتی بارش میں ۔ای کوئی کام کرنے کا ٹائم ہے؟ تیرا ما تھا بگڑ گیا ہے کا؟''

''نا رمضو کا کا، بگڑا نہیں ہے بگاڑنے کی کوشش کرر ہا ہوں''۔

''ارے بھک ،توں تو ہردم پھلسپھا بگھارتا ہے، ہم کو تیری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

کروگے تب نا سمجھوگے رمضو کا کیا''۔

ضیاءالبدر عرف شبراتی نے کہا تو رمضو اور چڑھ گیا۔

''ہم کیسے سمجھیں گے بھلا۔توں ٹھہرا پڑھا لکھا،ہم جاہل گنوار۔ پر تیرے ہی بھلے کی کہہ رہے ہیں۔ بیمار پڑ گیا تو کون سنبھالے گا تیرے کو۔تیری بہوریا بے چاری تو تیری ماں کی سیوا کرنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔

''بیمار ہی تو پڑنا چاہتا ہوں کا کا''۔

'' اے لو اور سنو۔ ہر کوئی اچھا رہنا چاہتا ہے اور ای سسرا بیماری بلانے کو کھوجتا ہے۔ پورے چھو دن ہو گئے بھادوں کی جھڑی لگے، تب سے اب تک چنے میں بھنگت دکھائی دیتا ہے۔ پرسوئے ڈاگڈر کے پاس بھی گیا تھا۔ایک طرپھ دوائی لینے جاتا ہے دوسری طرپھ پانی سے آدھی رات تک کھلواڑ کرتا ہے۔ ارے ہم پوچھتے ہیں تیرے کو بیمار پڑنے کا سوک ہے تو ڈاگڈر کے پاس کاہے کو جاتا ہے؟''

ایک ہاتھ میں ٹوٹی چھتری جس کے کپڑے میں کئی چھید تھے۔ دوسرے میں ڈنڈا پکڑے۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بڑبڑاتا ہوا بوڑھا رمضو اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

اداسی کے سمندر میں ڈوبا ہوا شبراتی سارے دن اور اتنی رات تک لگے رہنے کے بعد دو گھونٹ چائے پینے کی خواہش کو دبا گیا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مسلسل بارش اور تیز ہوا کی وجہ سے بجلی کے کھمبے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ تین دن اور راتیں بیت گئی تھیں بجلی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

شبراتی کے دونوں پیر گھٹنوں سے اوپر تک کیچڑ میں سنے ہوئے تھے۔ اگر اسے نماز نہ پڑھنی ہوتی تو شاید وہ یہ بھی کر ڈالتا کہ بیمار پڑنے کے لئے کیچڑ اور گندگی سمیت سو جاتا۔

دیوار سے سٹی کھری الماری کے اوپر سے ، ماچس کی ڈبیہ اٹھا کر اس نے تیلی جلائی اور مٹی کے تیل والا لیمپ جلا دیا۔ لیمپ کا شیشہ میلا میلا سا ہو رہا تھا، اس لئے روشنی بھی دھندلی سی ہو رہی تھی۔ لکڑی کے پرانے ٹیبل پر لیمپ رکھ کر وہ نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گیا۔

اب رات کے نو بج گئے تھے۔ بارش ابھی بھی ہو رہی تھی ۔ سارے دن کیچڑ اور پانی میں لتھڑے رہنے کے باعث اس کے پیروں کی چمڑی سکڑی سکڑی سی ہو گئی تھی ، ناخن سفید ہو گئے تھے، انگلیاں اکڑی سی گئی تھیں۔ وہ پورے چاند کی رات تھی جب شبراتی پیدا ہوا تھا۔ شعبان المعظم یعنی کہ شب برأت۔ ماں باپ نے نام ضیاء البدر رکھا تھا اور گھر کے لوگ سے شبراتی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

شبراتی کی عادتیں دوسرے بچوں سے مختلف تھیں۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ بچپن سے ہی نمازیں پڑھتا تھا۔ والدین کا فرماں بردا تھا۔ زندگی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی ، لیکن وقت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ ایک حادثے میں ابا کے

گزر جانے کے بعد سب کچھ بدل گیا۔ ماں اپنے دونوں بیٹوں کے لے کر اپنے میکے چلی آئی۔ اس وقت شبراتی دس سال کا رہا ہوگا۔ اس کا بھائی اس سے تین سال بڑا تھا۔ پندرہ سال کا ہوتے ہوتے بھائی کو کام میں لگ جانا پڑا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد نانا بھی مالک حقیقی سے جا ملے۔ اماں اور بھی اکیلی ہوگئی۔ بڑا بھائی یک روپے روز کی مزدوری پر لگ گیا۔ اماں سلائی کڑھائی کا کچھ کام کرلیا کرتی تھیں۔ شبراتی مال لانے لے جانے میں ماں کی مدد کرتا تو تھا لیکن اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ لہذا، دن میں ماں کا ہاتھ بٹاتا اور رات کو دیئے کی پیلی پیلی روشنی میں پڑھائی کرتا تھا۔ آنکھ اور جسم دونوں پر اثر پڑا تھا۔ وہ آگے بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑے بھائی نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

''ماں مر جائے گی تب تمہاری پڑھائی کس کے کام آئے گی؟ ایک ڈیڑھ روپے کی مزدوری میں ہم تین لوگوں کا گزارا ہو جائے گا کیا؟ ہر چیز کی قیمت بڑھتی جارہی ہے، اماں کے لئے دوا چاہئے۔ ایسے کب تک چلے گا بھلا؟''

تب شبراتی نوکری کی تلاش میں گھر سے باہر نکل گیا۔ اس وقت یہ کوکری نئی نئی کھلی تھی اور کام کرنے کے لئے لوگ تلاشے جارہے تھے۔ بھٹکتا بھٹکتا شبراتی بھی ادھر آیا اور اسے سترہ روپے ہفتے پگار پر نوکری مل گئی۔

تب سے اب تک شبراتی بڑی ایمانداری سے اپنا کام کئے جا رہا تھا۔ اپنے ادھورے خواب پورے کرنے کے لئے شبراتی نے اپنے بیٹے کو چھوٹ دے دی کہ وہ جتنا چاہے پڑھے۔ اس کے بیٹے نے ایک نہیں پوری تین تین ڈگریاں حاصل کیں لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ آج کے دور میں نئی نسل ڈگریوں کا بوجھ اپنے کندھے پر ڈالے جانے کن کن گلیوں کی خاک چھانتی پھرتی ہے، انہیں نوکری نہیں ملتی۔ ہر طرف رشوت، جھوٹ اور سفارش چاہئے ہوتی ہے۔ ملک کے انہی نوجوانوں کے صف میں اس کا بیٹا بھی کھڑا تھا۔ اس کے پاس نہ سفارش تھی نہ رشوت، بس ڈگریوں کا بوجھ تھا

اور وہ اسے ڈھوتا پھر رہا تھا۔

کئی بار اس کا بیٹا مقابلوں میں شامل ہوا۔ کامیاب بھی ہوا لیکن ہر بار لوگوں کا جم غفیر اسے پیچھے دھکیل کر آگے نکل گیا۔ کئی سال کی بھٹکن کے بعد بھی جب اس کے بیٹے کو نوکری نہیں ملی تو وہ ایک دم سے ٹوٹنے لگا۔ پھر اس نے مجبور ہو کر اپنی نوکری اسے دے دینے کی سوچی۔ ماں بار بار اس کا گھر بسانے کی بات کرتی تھی "اب گھر کی اداسی نہیں جاتی، مجھے میرے پوتے کی دلہن دکھا دے"۔

لوگ کہتے "پڑھا لکھا بیٹا تو بلینک چیک کی طرح ہوتا ہے جو چاہے بھر لو" لیکن شبراتی کی سوچ ان سب سے الگ تھی۔ "بیکار بیٹے کو کون اپنی بیٹی دے گا اور اگر کوئی قسمت کا مارا دے بھی دے تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے دوسرے کی بیٹی کی زندگی سے کھلواڑ کرنے کا"۔

ان دنوں کچھ معاملوں میں ایسا ہوتا تھا کہ اگر کوئی شخص خود کو "ان فٹ" محسوس کرے اور اپنی نوکری کسی اور کو دینا چاہے تو اسے اپنے ریٹائرمنٹ سے تین سال پہلے نوکری چھوڑ دینی پڑتی تھی۔ شبراتی کی سروس ابھی چار سال باقی تھی۔ سو اس نے بھی اس نکتے پر سوچنا شروع کر دیا۔

گرچہ رمضو اور اس جیسے کچھ اور بزرگ جو اس کا بھلا چاہتے تھے انہوں نے اس خیال سے باز رہنے کی تاکید کی تھی۔ "کون جانے نوکری مل جانے کے بعد جب بہو آئے اور تیرا بیٹا بدل جائے اور تم دونوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے"۔

پر شبراتی نے کہا "اب ہمارا کیا ہے کاکا..... ہم لوگوں کا گزارا ہو نہ ہو بیٹے کی زندگی تو بن جائے گی ورنہ اعلیٰ تعلیم کے بعد بھی رشوت کے لئے پیسے اور سفارش کے لئے کوئی منتری، مکھیہ منتری کہاں سے لاؤں گا؟"

لیکن جب شبراتی نے اس راستے پر پہلا قدم رکھا تو معلوم ہوا یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے اسے بیمار پڑنا ہوگا۔ بیماری بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ

کوئی بڑی بیماری جیسے کینسر، فالج، ہارٹ اٹیک وغیرہ۔ اس رات شبراتی بہت رو دیا تھا۔گناہ کرنے سے پہلے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔صبح ہوتے ہی وہ خود کو بیمار کرنے کے جتن میں لگ گیا۔

کئی موسم آئے اور چلے گئے۔ وقت کا پہیہ تیزی سے سرکتا گیا۔کئی ساون آئے اور چلے گئے۔اپنے اصولوں کی کال کوٹھری سے باہر آکر دنیا کی بھیڑ میں اپنے بیٹے کو جگہ دلانے کے لئے اس نے کئی ٹھوکریں کھائیں مگر اپنی منزل تک پہنچ نہ سکا۔

اور تب اس نے بری طرح پان، زردہ اور تمباکو وغیرہ چبانا شروع کر دیا، پانی میں بھیگا اور کیچڑ میں لتھڑا۔

پورے ایک ہفتے بعد وہ گاؤں سے لوٹا تھا اور آتے ہی اپنے حصے کا بچا ہوا کام نپٹانے لگ گیا تھا۔آج بہت تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دن بھر اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا اور ڈیوٹی سے بہت دیر میں لوٹا تھا۔نہانے کے بعد اس نے دن بھر کی قضا نماز ادا کی تھی۔ اس کے بعد ایک چھوٹی سی پتیلی میں چینی اور پانی ڈال کر پڑوسی کے دروازے کے باہر سلگتے ہوئے چولہے پر چڑھا دی۔ چائے کی پتی لے کر آتے آتے پانی کھول گیا تھا۔ چوں کہ سلگتے چولہے کا دھواں ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا اس لئے چائے میں تھوڑی دھوئیں کی مہک گھل گئی تھی۔ دھوئیں کی مہک اتنی بری بھی نہیں تھی۔ پیالے میں ڈال کر اس نے چائے ہونٹوں سے لگالی۔

پہلا گھونٹ لیتے ہی چائے اس کی ناک پر چڑھ گئی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔اس کا سارا وجود ہلنے لگا اور چہرہ لال ہو گیا۔ پڑوسی دوڑ کر اس کے پاس آیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ اتنا بڑا کاہے کو چائے پی رہے تھے۔ بھوریا سے کہہ دیتے تو پہلے ہی چائے بنا کے تم کو دے دیتی۔ غضب کرتے ہو تو بھی بھیا۔مگر چائے کا ایسا بہانہ لگا کہ پھر گھنٹوں اس کی کھانسی نہیں رکی ورا چانک تیز بخار نے اسے آگھیرا اور اسے سپتال میں بھرتی ہونا پڑا۔اس کا گلا بھی سوج گیا تھا اور جلد سرخ ہو گئی تھی۔

کئی طرح کے چیک اپ ہوئے۔ تین دن بعد فائنل رپورٹ آئی تھی۔ بخار کم تو ہو گیا تھا مگر کمزوری بہت تھی۔

شبراتی کو ڈاکٹر نے اپنے چیمبر میں بلوایا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں فکر کی سکڑن دیکھ کر شبراتی کا دل دھڑکنے لگا۔

''شبرا.....تی .... .'' ڈاکٹر نے جیسے بہت دور سے اسے پکارا تھا۔ ''یہاں آؤ''۔ اپنے سامنے رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کر کے بولا ''بیٹھ .... جاؤ.....''

''کیا آج میری تپسیا پوری ہو جائے گی؟'' جیسے اپنے آپ سے بولا تھا شبراتی۔ ''یہ... کیا کہا'' ڈاکٹر نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کچھ نہیں سر! ہم کو اپنے آپ سے بات کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ آپ بولیے نا سر''۔

اپنی سوچتی آنکھوں کو سکوڑے ڈاکٹر کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ''تمہارے ساتھ اور کوئی ہے؟''

''کون ہو گا بھلا۔ بیٹا نوکری کی تلاش میں شہروں کی گلیوں میں بھٹک رہا ہے بیوی گاؤں میں میری ماں کی سیوا میں لگی ہوئی ہے''۔

''بات یہ ہے کہ ہر بات مریض سے نہیں کہی جاتی''۔

''لیکن میری بات آپ کو مجھ سے ہی کہنی ہو گی ڈاکٹر''۔

''تمہیں میرا مطلب ہے ضیاء البدر عرف شبراتی تم کینسر کی لپیٹ میں آ گئے ہو''۔

''سچ.....! سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر بابو! پھر تو میرے بیٹے کو.....''

''کیا.....!؟ ڈاکٹر نے حیرانی سے اس کا منھ دیکھا، تمہارا مطلب ہے کہ.....''

''ہاں سر۔ میں نے اسی دن کے لئے سارے جتن کیے تھے کہ میری جگہ

میرے بیٹے کو نوکری... مگر یہ ہوا کیسے ...... دو ہفتے پہلے تک تو......''

''یہ بیماری ایسی ہی ہوتی ہے . ...اور سن لو کہ تم آخری اسٹیج میں ہو، اپنے لوگوں کو بلوا لو''۔

''کیا...... کہا ڈاکٹر...... میں...... میں....... میں.....''

''ہاں، تمہارے پاس وقت نہیں بچا۔ تم تین مہینے، تین ہفتے یا تین دن میں بھی.....''

''نہیں ڈاکٹر ......'' شبر تی گھبرا کر اسٹول سے اٹھ گیا۔ جھوٹے سرٹیفکٹ کا بوجھ مجھ سے اٹھایا نہیں جاتا، اس لئے میں نے سچ مچ کا بیمار ہونا چاہا۔ اپنے بیٹے کے لئے، اس کے بھوشیہ کے لئے مگر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اپنے بیٹے کا بسا ہوا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بچوں کی کلکاریاں سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بچا لو...... ڈاکٹر۔ مجھے بچا لو!!

☆☆☆

اپنا اپنا دکھ

ڈھلتی رات کا چاند آسمان کے سرمئی کناروں پر بیوہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی مانند بکھرا ہوا تھا۔

ندی کا پانی لہو رنگ ہو گیا تھا اور دور دور تک لاشوں کی قطاریں پسری ہوئی تھیں۔

ابھی کل تک ان سب نے مل کر خوشی کے گیت گائے تھے۔ دھان کی فصل پک کر تیار ہوئی تھی۔ محنت کشوں کی محنت کا پھل سامنے آیا تھا۔ نئے دھان کی خوشبو کا تصور ان کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ اتار لایا تھا۔

اپنی اپنی ہنسیاؤں کو رگڑ رگڑ کر ان سب نے چمکایا تھا اور رات گئے تک اپنے اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ بیٹھ کر آنے والے دنوں کے خوش آئند خواب بنے تھے اور پھر اپنے اپنے ننھے منوں کو اپنی اپنی بانہوں میں سمیٹ کر سال بھر پرانے پوال کے نرم گرم بستروں میں سمٹ کر صبح تازہ دم ہو کر اپنے اپنے کاموں کی شروعات کی نیت لے کر سو گئے تھے۔

ان لوگوں میں بستی کا سب سے عمر دراز آدمی نبی جان بھی تھا۔ لیکن نبی جان غریب نوا جھونپڑی میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کا بس ایک پوتا تھا، جو کئی مہینوں سے نوکری کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کی ایک حادثے میں موت ہو چکی تھی۔

اس وقت بہت چھوٹا تھا اجو۔ بیٹے بہو کے گزر جانے کے بعد نبو نے ہی اسے پالا تھا۔ دن رات مزدوری کر کے اسے پڑھایا تھا۔ گریجویشن کے ساتھ ساتھ ایک پروفیشنل کورس بھی کرایا تھا۔

پھر بھی سے اب تک نوکری نہیں ملی تھی۔ وہ کئی مہینوں سے نہ جانے کس کس شہر کی کس کس گلی میں بھٹک رہا تھا۔ بوڑھا نبی جان ہر روز امید کا نیا چراغ روشن کر کے اس وقت کی راہ دیکھا کرتا تھا، جب اس کے پوتے کے قدم خوشی کے پالنے میں جھولنے لگیں۔ اس کی جھونپڑی ایک گھر میں بدل جائے، جس کے آنگن میں پوتے کی دلہن کی کلائیوں میں پڑی سرخ سنہری چوڑیوں کی چھن چھن گونجا کرے۔

اجو کے چلے جانے کے بعد نبو کی نیند اتھلی تھالی میں بھرے پانی جیسی چھچھل ہوگئی تھی۔ ذرا سی ہلی اور پانی چھلک گیا۔ بڑھاپے کی نیندیں بھی ذرا کچی کچی ہوا کرتی ہے۔ نبو کے ساتھ بھی ایسی ہی تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر اس کی نیند کھل جاتی تھی۔

اس دن بھی سب کی جھوپڑیوں پر سناٹا اتر جانے کے بعد ہی نبو کی آنکھ لگنا شروع ہوئی تھی۔ اچانک چند آوازوں نے س کی نیند کی ڈوری توڑ ڈالیں۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے اسے لگا کہ یہ اس کا وہم ہے یا پھر وہ آدھے سوئے آدھے جاگے میں خواب دیکھ رہا ہے، لیکن کچھ ہی پل میں اندازہ ہوگیا کہ نہ یہ وہم ہے، نہ خوب۔ آوازیں واقعی آرہی ہیں، مگر آوازوں کی سمت کدھر تھی اور یہ کیسی آوازیں تھیں، یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

بانس کی پھچیوں سے بنا اپنی جھونپڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آیا۔ اپنی بوڑھی مل جی آنکھوں کو مل مل ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

آگ، دھواں اور لاشیں، آہیں اور سسکیاں، اچانک اس کے سامنے یہ سارا منظر پھیل گیا تھا۔ بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے قدم ڈی، سی پی، صاحب کے بنگلے کی طرف اٹھ گئے اور پھر وہ دوڑتا چلا گیا۔

تب تک بستی کے تمام لوگ جاگ اٹھے تھے اور اچانک آئی اس افتاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب کی زبان گنگ اور دماغ سن ہو گیا تھا۔ بستی دھو دھو کر جلتی جا رہی تھی۔ لاشوں کے انبار بڑھتے جا رہے تھے۔

نبی جان کو ڈی سی پی صاحب کے بنگلے تک پہونچنے میں پورا آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اسے چکر آ رہے تھے اور پیر کانپ رہے تھے۔ ڈی، سی پی صاحب کا بنگلہ گاؤں کی سرحد کے پاس ایک ہرے بھرے مقام پر واقع تھا اور اس وقت وہ اپنے نرم بستر کے سینے پر سر رکھے گداز بانہوں کے سائے میں خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

بنگلے کے گیٹ پر تعینات دربان نے اسے دیکھتے ہی للکارا

''کون ہے رے؟ ادھر کاہے کو منھ اٹھائے گھسا چلا آتا ہے؟ حرام کے۔''

''اے؟ حرام کے۔''

''ہم.........ہم''

بوڑھا ہانپتے ہوئے کہنے لگا.

''ہم پاس والے گاؤں سے آئے ہیں۔ ہمارا نام نبی جان ہے۔ ہمارے گاؤں میں کچھ اسماجک لوگ گھس آئے ہیں اور گریبوں کی جھونپڑیوں کو جلا رہے ہیں۔ صاحب کو کھبر کرنا ہے۔ جلدی کریئے نہیں تو سب کھتم ہو جائے گا بابو۔''

''ہونہہ۔'' دربان نے منھ بچکایا ''ای کون نیو بات ہے۔ ای سب تو روجے....... ہوتا ہے۔ سبیرے دیکھ لیا جائے گا۔ اور اب سبیرا ہونے میں دیرے کتنا رہ گیا ہے۔؟''

''یہ کیا کہتے ہو بابو......... سویرے تک وہاں بچے گا کیا؟ جو دیکھو گے آمین! جلدی سے صاحب کو جگاؤ۔ وہ وہاں پولس اور ومکل بھیجیں۔''

''ای سمئے او جاگیں گے؟ پگلا گئے ہو کا بڑھؤ؟''

''کب جاگیں گے وہ؟ جب سب کچھ راکھ راکھ ہو چکا ہوگا؟
سہاگنوں کی مانگ اور ماؤں کی گود سونی ہو جائے گی؟''
نبی جان کو غصہ آ گیا:

''جگاتے ہو یا، یا ہم خود دروازہ پیٹنے لگیں۔ ہم ای بڑھاپے میں وہاں سے پیدل دوڑے آ گئے اور صاحب نیند کا مجا لے رہے ہیں؟''

''تہ کا کریں، ہم، ہم نے تم کو داوت دیا تھ۔ داوت دے کے تو نہیں بلائے ہیں ہم تم کو......! تم اپنے سے آئے ہو تو اب سیرے تک یہیں بیٹھو چپ چاپ۔''

دربان نے یہ کہہ کر ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا کونے میں رکھ دیا اور جیب سے تمبا کو نکال کر ہتھیلی پر ملنے لگا۔

نبی جان نے لپک کر ڈنڈا اٹھایا اور دھڑاک سے دروازے پر دے مارا۔ ''کون ہے رے۔ ی سب کا ہو رہا ہے؟ حرام کے .... تیرے کو چڑھ گئی ہے کا؟''

''جی .... سر، ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ای ایک ٹھو بڑھوا آ کے تو پھان مچا رہا ہے۔''

''کا ہے رے! تیرا ماتھا پھر گیا ہے کا۔؟ ارے رموا۔ ڈال دے اس کو لاک اپ میں، صبح اس کا کریا کرم کریں گے۔''

''ارے ....او.. ... . ڈی سی پی صاحب ہم کو تم لاک اپ میں ڈالو چاہے جہنم میں، مگر خود گھر سے باہر نکل کے دیکھو، تمہارے سامنے والی بستی میں کیا ہو رہا ہے؟''

''جو ہونا ہے او تو ہوئے کرے گا۔ ہم کو صبح تک سوچنا ل ہی جائے گی۔ تم کا ہے کو آ گئے ہمارا ماتھا کھراب کرنے؟''

''ارے رموا اس کو لے کے جاتا کا ہے نہیں؟ سا......لا، ساری رات

کھراب کرڈالی۔ ہونہہ۔'' بیچ سے تھوک کرانہوں نے اپنی کھڑکی بند کرلی۔

''چل بڑھؤ۔'' دربان نے بازو پکڑ کر اسے کھینچا اور کوٹھری میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا۔ نبو چلتا رہا۔ بستی چلتی رہی، لوگ مرتے رہے، ڈی سی پی صاحب سوتے رہے اور صبح کی سنہری کرنیں لہو رنگ ہو کر سارے میں پھیل گئیں۔

بستی کے بچے کھچے لوگوں نے مل جل کر آگ تو بجھادی تھی، لیکن بے کفن لاشیں جانچ پڑتال کے انتظار میں پڑی رہیں۔ سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد پرشاسن کو ہوش آیا۔ کاغذی کارروائی شروع ہوئی۔ معزز افراد بلائے گئے۔ بستی والوں کو شوک سندیش، بانٹے گئے، مالی امداد کی امید دلائی گئی۔

مارے جانے والوں کے خاندان کے دو چار بچے کھچے لوگوں کو نوکری کا اشواسن دیا گیا۔ ایسے بھی لوگ تھے، جنہوں نے کبھی کسی کا حال تک نہ پوچھا تھا، ان کی آنکھوں میں نئے خواب اتر آئے تھے اور وہ لوگ ان کے ورثا کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے۔

سات بیت گئے۔

نبی جان عرف نبو اپنی جھونپڑی کے سامنے کھڑے پرانے پیپل کے پیڑ کے نیچے اکڑوں بیٹھا مسلسل روئے جا رہا تھا۔

حکومت کے معزز افراد آخری معائنے کے لئے بستی میں آئے ہوئے تھے۔ کس کی جھونپڑی بنوانی ہے، کسے نوکری دینی ہے، کون زخمی ہے ان تمام معاملات پر غور کرنا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ لوگ نبی جان کے پاس آئے۔

''ذرا دیکھو تو، اس کا کیا معاملہ ہے؟'' کسی سینئر نے اپنے جونیئر سے کہا:

''کئی دن سے بیٹھا روتا جا رہا ہے۔''

''کیا بات ہے بڑھؤ۔ تمہارا کیا کیا نقصان ہوا؟'' وہ قلم کاغذ نکالتے ہوئے بولا: ''کوئی سگا مر گیا؟''

''نہیں۔'' بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔

''جھونپڑی جل گئی؟''

''نا''

''فصل لٹ گئی۔؟

''نا''

''پھر تم پورے سات دنوں سے بیٹھے یوں آنسو کا دریا کیوں بہائے جارہے ہو؟''

''ہم اس لئے رو رہے ہیں کہ ہم کاہے نہیں مرے؟ ہم اگر ڈی سی پی کے پاس نہ گئے ہوتے تو لاک اپ میں بند نہ ہوتے، مگر ہمارے نصیب نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔ہم یہاں ہوتے تو مارے جاتے۔''

''لیکن تم مرنا کیوں چاہتے ہو بابا۔تمہارے جیسے لوگوں کی ہی تو دیش کی ضرورت ہے۔تمہارے اندر بڑی ہمت ہے۔اندھیری ٹھنڈی رات میں پیدل اتنی دور چلے گئے۔''

''ہمارا جانا کام نہ آیا۔مرنا کام آجاتا بیٹا۔''

''وہ کیسے۔''

''بیٹا میرا ایک پوتا ہے۔ایم اے پاس ہے، بڑی محنت سے پڑھایا، پالا، مگر نوکری نہیں ملی۔پچھلے کئی مہینوں سے شہر کی گلیوں میں بھٹک رہا ہے۔نہ جانے کیا کھاتا ہوگا۔کہاں سوتا ہوگا۔اگر ہم مر گئے ہوتے تو اسے آپ لوگ نوکری تو دلوا دیتے۔''

نبی جان ایک بار پھر پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆☆☆

میراث

ان دنوں اُداسیوں کا موسم شباب پر ہے۔

عرصے سے دروازے پر کوئی دستک سنائی نہیں دی ہے۔ پہلے اور کچھ نہیں تو پوسٹ آفس سے آئی ہوئی ڈاک ہی ہلکی سی خوشی دے جاتی تھی۔ بہت دن ہو گئے یہ سلسلہ بھی بند ہو چکا ہے اس کی وجہ جسمانی کمزوری اور تنہائی ہے۔

کوارٹر کے باہر کائی زدہ دیوار کے بیچ گری ہوئی باڑی میں ڈھیروں گھاس اُگی ہوئی ہے۔ جس کے پیچھے کوارٹر کا وجود کھو سا گیا ہے۔ گھر ایک دم جنگل سا لگنے لگا ہے۔

پہلے اسی باڑی میں طرح طرح کے پھول مسکرایا کرتے تھے۔ جہاں بھی جاتی وہاں سے کوئی نیا پودا لے آتی تھی۔ اپنے پہلے کئے گئے کاموں کی جھلک کسی چیز میں نظر آ جاتی ہے تو خود کو ہی حیرانی ہوتی ہے۔ کیا یہ میرے وہی ہاتھ ہیں جنہوں نے اتنا کچھ کیا تھا کبھی؟

اب تو کہیں کچھ نہیں بچا ہے۔ سوائے وقت کی لکیروں کے جنہوں نے میرے چہرے پر اپنا بسیرا بنا لیا ہے۔

ابھی کچھ ہی دیر پہلے کتابوں کی جھاڑ پونچھ کے درمیان ایک پرانی تصویر ملی ہے کتنا اجنبی لگ رہا ہے یہ چہرہ۔ اپنی تصویر خود ہی پہچان نہیں پا رہی ہوں۔

پندرہ سال پہلے اپنے قصبے گئی تھی۔ تو یہ تصویر میری بیٹی نے مجھے بوا کے کولے میں گھاس اکھاڑتے دیکھ کر کھینچی تھی۔ گاؤں میں کولا اس جگہ کو کہتے ہیں جو گھر کے پچھواڑے چھوٹی سی خالی جگہ جو اپنے مکان کی حد میں ہوتی ہے اسے گھیر کر بنائی جاتی ہے۔ آج اسے کچن گارڈن کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جگہ کی رکھوالی خود گھر کی عورتیں کرتی ہیں۔ اس جگہ کو نہ باغ کہہ سکتے ہیں نہ کھیت۔

بوا نے اس کولے پر بڑی محنت کی تھی اس کولے میں شریفے کا ایک پیڑ تھا اور دو بڑے پرانے بیر کے درخت تھے جن کی بیریں بہت میٹھی ہوا کرتی تھیں۔ دو درخت امرود کے تھے۔ ایک کا گودا لال ہوا کرتا تھا اس کی خوشبو بھی عام امرودوں کی خوشبو سے الگ ہوتی تھی۔

اپنی بیوگی کے پچیس برس بوا نے اس کولے کے سہارے گزارے۔ بُوا (پھوپھی) کی شادی تقریباً تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی اور تین تیرہ نو اٹھارہ کے مصداق تیرہواں سال بُوا کے لئے گردش کا سال ثابت ہوا۔ جب شادی ہوئی تو ان کی عمر بارہ سال تین مہینے تھی۔ اور جس دن تیرہ سال پورے ہوئے پھوپھا ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ پھوپھا کے مرنے کے تین مہینے بعد انہیں ایک بیٹا ہوا تھا جو نو سال ہوتے ہوتے ندی میں ڈوب کر مر گیا۔

ابا میاں بوا کے سوتیلے بھائی تھے۔ بوا اپنی ماں کی اکیلی بیٹی تھیں اور ابا بھی اکیلے ہی تھے۔ لیکن سوتیلی ماں کا سلوک بوا کے لئے کبھی اچھا نہیں رہا تھا۔ لیکن بوا نے ہر کسی کے لئے قربانی دی تھی ہر کسی کو پیار کیا تھا۔ اور دنیا میں شاید سب سے زیادہ انہوں نے اپنے سوتیلے بھائی یعنی ابا میاں کو پیار کیا تھا۔

ابا میاں بڑے ہو کر بڑے عالم بنے۔ اس زمانے میں اس پورے علاقے میں ابا میاں سے بڑا کوئی عالم دین نہیں تھا۔

بُوا نے کبھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی تھی بس دیتی رہی تھیں۔ اپنے کولے کے ایک

کونے میں انہوں نے کچھ چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا رکھی تھیں جن میں میتھی، پالک اور چنے کے ساگ اُگایا کرتی تھیں۔ اپنے پیڑوں کے بیر اور امرود بیچ کر مڑوا اور موٹا چاول خرید لیا کرتی تھیں۔ کچھ مسالے اور تھوڑا تیل بھی اسی میں آجاتا تھا۔ ساگ کی کیاریوں میں بُوا وضو کر لیتی تھیں اسی پانی سے ساگ اُگ آتے، ان میں برکت بھی بہت ہوتی تھی۔ خود کھانے کے علاوہ وہ ساگ اور بیریں اڑوس پڑوس میں بانٹ بھی دیا کرتی تھیں۔

مڑوے کی روٹی!

ابھی ابھی مجھے یاد آیا کہ پچھلے ہفتے جانچ کے دوران خون کی کمی کو دور کرنے کے لئے آج کے زمانے کی گولڈ مڈلسٹ ڈاکٹر نے مجھے مڑوے کی روٹی گڑ اور گھی کے ساتھ کھانے کو کہا ہے۔

''مڑوا دیکھا ہے؟'' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''جی دیکھا تو نہیں۔ لیکن سنا ہے اس کی روٹی کالے رنگ کی ہوتی ہے''۔ میں نے جواب دیا تھا۔

''ہاں کالے رنگ کی ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بڑے گن ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا تو مجھے یاد آیا اماں بھی کہتی تھیں انہیں بُوا نے بتایا تھا کہ ''اس روٹی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔''

بُوا کے ہاتھ اور شانے چوڑے اور مضبوط تھے۔ قد بھی اونچا تھا رنگت سرخی مائل، آنکھیں غلافی اور لمبے لمبے بال بھی تھے۔ مڑوے کی روٹی اور ساگ کھا کر ہی تو بُوا ایسی تھیں۔

بُوا نے چودہ سال کی عمر کے بعد پیروں میں مرتے دم تک جوتی نہیں پہنی تھی۔ اس کی وجہ بھی دادی یعنی بوا کی سوتیلی ماں تھیں۔ ہوا یہ تھا کہ ابا میاں رام پور میں نواب رام پور کی نگہداشت میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک دن ساتھیوں کے

ساتھ گھومنے نکلے۔ میلہ لگا ہوا تھا وہیں میلے میں ابا کو ایک زنانی جوتی پسند آگئی وہ انہوں نے خرید لی یہ زنانی جوتی بُوا کے سائز کی ہی تھی۔ سو ابا نے وہ جوتی لا کر اپنی بہن کو دے دی۔ بُوا نے وہ جوتی آنکھوں سے لگا لی کیونکہ یہ ان کے بھائی کا دیا ہوا تحفہ تھا لیکن ایک دن دادی کا مزاج انہیں جوتی پہنے دیکھ کر بگڑ گیا اور انہوں نے بُوا کو کئی کوسے دے ڈالے۔ ساتھ میں طعنہ بھی کہ۔

''بیٹے کے چمڑے کی جوتی پہنے گھوم رہی ہے۔'' گاؤں میں دیہات کی عورتیں اکثر ایسے اوٹ پٹانگ طعنے دیا کرتی ہیں۔ لیکن بُوا کے دل میں یہ بات تیر کی طرح لگی تھی۔ انہوں نے کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن اس وقت جوتی اتار کر گھر کے ایک پُرانے طاق پر ڈال دی۔ پھر ایک دن اپنے ننیہالی گاؤں جاتے وقت وہ جوتی ٹرین کی کھڑکی سے ندی میں پھینک دی تھی۔

بُوا کا کولا اور کچا مکان ان کی اپنی ملکیت تھی یہ سب پھوپھا سے انہیں دین مہر میں ملا تھا۔ جو ان کے مائکے یعنی دادا میاں کے مکان سے لگا ہوا تھا اسی لئے ان کی ہر چیز دادی کی نظر میں رہتی تھی۔۔ گرچہ جوتی والے اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد دادی گذر گئی تھیں اور بوا نے ان کی حتی المقدور خدمت کی تھی۔ لیکن جوتی انہوں نے عمر بھر نہیں پہنی اور برسوں ننگے پیر چلا کیں۔ ابا نے اس کے بعد کئی بار بُوا کے لئے جوتی لانی چاہی لیکن بُوا نے منع کر دیا۔ اب گھر میں ابا۔ اماں اور بُوا کے سوا کوئی بچا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی جب بوا کا نو سالہ بیٹا ندی میں ڈوب کر مرا، بُوا نے بیر کا ایک پیڑ بیچ کر اس کے کفن دفن کا انتظام کیا۔

بُوا اب اور بھی اکیلی ہو گئی تھیں۔ اماں سے جتنا بنتا ہے بُوا کی دلجوئی کرتی تھیں۔ پھر ایک دن بوا کو بخار نے گھیرا۔ ان کے گورے بلند چہرے پر برسوں کی تھکن اتر آئی۔ ایسی حالت میں بھی بُوا کی یہی کوشش رہتی کہ وہ اپنا کام خود کریں۔

لیکن ایک دن ان کے اعضاء جواب دینے لگے۔ پھر ایک دن انہوں نے

خود کو بے حد کمزور محسوس کیا۔ وہ اٹھیں مغرب کی نماز ادا کی اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

''اے خدا تو مجھے مجبور نہ بنا۔ اس سے اچھا یہی ہے کہ تو چلتے پھرتے مجھے اپنے پاس بلا لے۔''

شاید بُوا کی دعاء میں بہت اثر تھا۔ جو کہ تیسرے ہی دن سامنے آ گیا۔ جمعہ کے دن غسل کے بعد انہوں نے نماز ادا کی اور نماز کی ہی چھوٹی چوکی پر لیٹ گئیں۔ عصر کی نماز کے بعد جب اماں نے انہیں چائے لا کر دی تو وہ نہیں اٹھیں۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن جسم بے جان ہو چکا تھا۔

اس واقعے سے ایک دن پہلے انہوں نے اپنے گھر اور اپنے کوے کی دیکھ بھال کا ذمہ اپنی بھاوج (یعنی اپنی ماں کو) سونپ دیا تھا۔

بُوا کے بعد کئی سالوں تک اماں نے اس زمین کی بھرپور دیکھ ریکھ کی۔ اماں کے برے دن آئے تب انہیں بھی اسی کولے نے سہارا دیا۔ کچھ دن بعد ابا بھی نہیں رہے تھے۔ ابا کی بیماری کی حالت میں ایک دن اماں نے رو رو کر کہا تھا۔

''مجھے کس کے سہارے چھوڑے جا رہے ہیں؟'' تب ابا نے کہا تھا۔

''گھر ہے!''

جب اماں کے بیٹے بڑے ہو کر اپنے کام سے لگے تو اماں کو ساتھ لے جانا چاہا۔ لیکن اماں کا گھر اور کولے سے لگاؤ آڑے آ گیا۔ اماں ان امانتوں کو چھوڑ کر کہیں جانے کو تیار نہیں ہوئیں۔ اور اسی گھر میں عمر گزار دی۔ کبھی ایک دو دن کے لئے بیٹوں کے پاس آ جاتی تھیں۔

دھیرے دھیرے اماں کی حیثیت بھی پوری ہوئی۔ بڑے بیٹے رٹائر ہو کر گھر پہنچے اتنی کمزور حالت میں بھی اماں نے لیپ پوت کر دو کمرے سنوار رکھے تھے۔ باقی حصہ ادھر ادھر ڈھنے لگا تھا۔

ابھی تین سال پہلے میں بھی گھر گئی تھی۔ اماں بہت بیمار تھیں۔ لیکن مجھے بوا

کے کولے کو بھی دیکھنے کی خواہش تھی۔ اماں سے اجازت لے کر میں اپنے رشتے کی ایک بہن کو ساتھ لے کر اس کے آنگن کی ٹوٹی دیوار پھلانگ کر بُوا کے کولے میں اتر گئی۔ بُوا کے کولے کے تینوں طرف لوگوں نے اپنے مکان بنا لئے تھے۔ سامنے ایک مدرسہ بن گیا تھا۔ بُوا کی ملکیت چاروں طرف سے گھر گئی تھی اور جس سے جتنا بنا اس نے بُوا کی زمین دبالی تھی۔ اب بیچ کا حصہ بہت تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ لیکن بیر اور امرود سے لدے درخت اب بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا بوا کی روح اب بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ بھری دل لے کر وہاں سے لوٹی تھی۔ لوٹتے لوٹتے جھاڑیوں میں مجھے شریفے کا ایک ننھا سا پودا نظر آ گیا تھا۔ زمین بہت سوکھی سوکھی سی ہو رہی تھی۔ یہ پودا کئی پتھروں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے لکڑی کے ایک ٹکڑے سے جو ذرا نوکیلا سا تھا کھود کھود کر ہم نے وہ سوکھا سا پودا نکال لیا۔ گھر لا کر گیلے بورے میں لپیٹ کر اسے رکھ دیا کیونکہ یہاں لوٹنے میں بھی دیر تھی۔

گرچہ اس کے پنپنے کی امید بہت کم تھی پھر بھی یہاں لا کر میں نے اسے اپنی باڑی میں لگا دیا۔ اور صبح و شام پانی دینے لگی۔

ایک دن میاں نے چڑھ کر کہا۔

''کیا سوکھی لکڑیوں کو پانی پلاتی ہو، وقت کی بربادی کے سوا اس کا حصل کیا ہے؟ مردے بھی زندہ ہوتے ہیں کہیں؟ یہی وقت تم دوسرے تخلیقی کاموں میں لگا سکتی تھیں۔''

''تخلیقی کام؟ کیا بُوا نے جو کیا وہ تخریبی کام تھا؟''

''مطلب؟'' وہ اور چڑھے۔

''مطلب یہ ہے کہ یہ پودا بوا کے کولے کا ہے اس میں بُوا کی روح زندہ معلوم ہوتی ہے۔''

''بوا کے کولے کا؟ لیکن یہ تمہیں کہاں سے مل گیا؟''

"پچھلی بار جب گھر گئی تھی تو دیوار پھلانگ کر وہاں گئی تھی مجھے لگا بوا کہہ رہی ہیں۔

"اسے تم اپنی حفاظت میں لے لو۔ کون جانے وہ زمین کس کے حصے میں چلی جائے۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے یہ پودا کھاڑ لائی ہوں۔"

"اگر یہ پودا واقعی بوا کے کولے کا ہے تو یہ تمہارے لئے باعث ثواب ہوگا اگر تم اس کی دیکھ بھال کرتی ہو۔"

تب سے میں اور جی جان سے اس پودے کی دیکھ ریکھ کرنے لگی تھی۔ لیکن ادھر کافی دنوں سے اپنی بیماری اور مسلسل ہاسپٹلوں کے چکر لگانے کے باعث اس طرف دھیان نہیں دے پا رہی ہوں۔ یہ پورا سال لگ بھگ ہسپتال میں ہی گذارے۔ لکھنا بھیجنا کچھ بھی نہیں ہو سکا ہے۔ آج عرصہ دراز کے بعد کاغذ قلم اٹھایا ہے۔

لیکن بے دلی نے اپنا اثر ڈال رکھا ہے۔ ذہن خالی سا ہو رہا ہے۔ سوائے ہسپتال کے کچھ تجربوں کے کچھ بھی مٹھی میں نہیں ہے۔ ان ٹکڑوں کو یکجا کر کے ایک کہانی کی تخلیق کرنے کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی نہیں ہو سکا۔

دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کون آیا ہے۔ "پوسٹ مین.....!" یہ آواز سن کر چونک گئی ہوں۔ عرصہ دراز کے بعد یہ آواز سنائی دی ہے۔ دوڑ کر دروازہ کھول دیا ہے۔ پوسٹ مین نے ایک رجسٹرڈ لفافہ آگے بڑھا دیا ہے۔ ساتھ میں دستخط والا کاغذ بھی۔ دستخط کر کے لفافہ لے لیا۔

یہ خط بڑے بھیا کا ہے۔ انہوں نے اطلاع دی ہے کہ بوا کے کولے کا سودا طے ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ زمین مدرسے سے لگی ہوئی ہے اس لئے مدرسے والے ہی اسے خرید رہے ہیں۔ جتنی زمین لوگوں نے بے ایمانی سے دبالی تھی اسے چھوڑ کر یہ معاملہ طے ہو ہے۔ لہٰذا تم لوگ آ کر اپنے اپنے حصے کی رقم لے جاؤ۔

جس طرح خدا بے ایمان اور ایمان دار دونوں کو روزی دیتا ہے اسی طرح بوا نے

سب کے لئے کچھ نہ کچھ چھوڑ دیا تھا۔

خط کو حفاظت سے رکھ کر میں آنگن میں نکل آئی اور پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔

بہت دنوں تک بند رہنے کی وجہ سے دروازہ زنگ آلود ہو گیا ہے۔

باڑی میں لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی ہے۔ برسات کی نمی ابھی قائم ہے۔ کھرپی لے کر میں گھاس صاف کرنے میں جٹ گئی ہوں۔ ان کے اندر چھپا ہوا شریفے کا پودا سلامت ہے۔ اور اس کی شاخوں میں ننھی ننھی کلیاں چھپی مسکرا رہی ہیں!!

اور میں سوچ رہی ہوں اس پودے کی جڑ کو پہلے بوا نے پھر اماں نے سنبھالا تھا، جواب میری حفاظت میں ہے۔ لیکن کیا، ہماری اگلی نسل بھی اس کی حفاظت کر سکے گی؟

☆☆☆☆☆

دل کیسی چیز؟

ٹھٹھری : ہوئی چاندنی ہاسپٹل کے باغ میں اتری ہوئی تھی اور ایک سایہ بے چینی سے موسم کی ٹھٹھرن سے بے نیاز اس باغ میں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ سایہ کبھی باغ میں کبھی ہاسپٹل کے کیبن نمبر ۳ کے بیچ مسلسل گھوم رہا تھا اور رات گہری ہوتی جارہی تھی۔

پورے ہسپتال میں سناٹے کی چادر تنی ہوئی تھی ماسوا اس کے کسی دور دور از وارڈ کے بند دروازے کے اندر سے کسی کے کھانسنے کی ہلکی سی آواز برآمدے میں اتر آتی تھی۔

آج آذر کا بت ٹوٹنے کو تھا اس کی ساری زندگی کا سرمایہ اور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر آذر بے بس تھا۔

یہ دل ہے کیا بس چھوٹا سا گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں۔

اس نے آج تک بہت سے بگڑے ٹوٹے پھوٹے دلوں کا علاج کیا تھا لیکن اب سے چند روز پہلے جو دل کا معاملہ اس کے سامنے آیا تھا اس سے اس نے اپنے ہوش کھو دیئے تھے۔

ان چند دنوں میں اس نے ہارٹ سے متعلق میڈیکل سائنس کی تمام اہم ترین کتابیں پڑھ ڈالی تھیں لیکن ایسے کیس کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملا تھا۔ انسان کے اتنے بڑے جسم کے اندر وہ ننھی سی چیز نہ ہوتی تو کیا آدمی، کیا جانور، کیا چرند اور کیا پرند غرض ہر جانور اس دل کا محتاج ہے۔ کیا کوئی تصور بھی کرسکتا ہے کہ کوئی آدمی دل کے بغیر

جی رہا ہوگا؟

چندن دن پہلے ہی تو اس کے آنگن میں خوشبو نے رقص کیا تھا۔ اور شبنم نے موتی برسائے تھے۔ کوئلیں کوکی تھیں۔ بلبلوں نے نغمے سنائے تھے۔ اور اچانک ہی چمکتے ہوئے چاند پر کسی پرند سیاہ نے اپنا سایہ ڈال دیا تھا۔ اور گرم انگاروں نے شبنم کے موتی چاٹ لئے تھے۔

رقص کرتے کرتے ثمینہ اچانک ہی چکرا کر گر پڑی اور خوشیوں کی محفل غم کے سیہ خانے میں بدل گئی تھی۔ یہ محفل آرائش آذر اور ثمینہ کی منگنی کی رسم کی تھی۔ آذر نے ثمینہ کو لے جا کر جانے کتنے خواب بنے تھے۔

جب ثمینہ کو ہوش میں لانے کی تمام ترکیبیں بے کار ہوگئیں تب اسے ہسپتال لے جایا گیا۔ اور جانچ کے دوران جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ ثمینہ کے سینے میں دل ہے ہی نہیں تو آذر ہی کیا تمام متعلقہ لوگوں کی آنکھیں پتھر کی سی ہوگئی۔ زبان بند ہوگئی اور منھ کھلے رہ گئے جیسے کوئی ساحر سحر پھونک گیا ہو اور سارے جاندار پتھر کی مورتیں بن گئے ہوں۔

کئی دن گزر چکے تھے۔ اس درمیان باہر کے کئی ڈاکٹر بھی بلوائے گئے۔ لیکن ایسے دل کے موضوع پر سبھوں کے ذہن ماؤف ہوگئے تھے۔ میڈیکل سائنس میں ایسا کیس اب تک نہیں آیا تھا کہ کوئی جاندار بغیر دل کے جی رہا ہو۔ دل میں سوراخ کی سوجن دل کی نالیوں میں چونے یا چربی کا جم جانا یا دل کا بیکار ہو جانا جیسی بیماریاں تو ہوتی ہیں۔ لیکن دل کی جگہ جھلی کا ایک خول جیسے دانہ نکالا ہوا انار کا چھلکا۔ یا کمہار کا بنایا ہوا مٹی کا خالی گلک۔ ایسے دل کے متعلق انہوں نے اب تک کہیں نہیں پڑھا یا سنا تھا۔

ثمینہ کی سانسوں کی رفتار رفتہ رفتہ کم ہی ہوتی جا رہی تھی آذر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اس کا بت ٹوٹا جا رہا تھا اور وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند سر جھکائے سسک رہا تھا۔

ثمینہ کو ایک نئے دل کی ضرورت تھی ایک جیتے جاگتے دل کی گردے دو ہوتے ہیں ایک گردہ دے کر کسی کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ دل تو ایسی چیز ہے جو کوئی بانٹ ہی نہیں سکتا۔ دل دے دینے کے لئے ایک موت ضروری ہوتی ہے۔ آذر اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا کہ کرے تو کیا کرے۔ اسے بہرحال ثمینہ کی زندگی چاہئے تھی اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ خود اپنا دل نکال کر ثمینہ کے کلیجے میں جڑ دیتا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی چاند ڈھلتا جا رہا تھا نائٹ شفٹ میں کام کرنے والی نرسوں کی آنکھیں بھی ذرا ذرا جھپک رہی تھیں ڈاکٹر آذر اس وقت بالکل تنہا تھا۔ اور ٹھٹھرتی ہوئی رات کے سائے میں باغ میں بنی سیمنٹ کی ایک بینچ پر بیٹھا اوپر آسمان کو تک رہا تھا۔ بینچ برف کی سل کی طرح سفید اور ٹھنڈی تھی۔ لمحے سرکتے جا رہے تھے۔

اچانک ایک چکور اس کے سر کے اوپر سے پھڑپھڑاتی آسمان کی طرف اڑی تو آذر چونک اٹھا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس وقت صبح کاذب نے اپنے پنکھ پھیلا رکھے تھے صبح ہونے سے پہلے کا گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔ رات کی شفٹوں میں کام کرنے والی نرسیں جھپکیاں لے رہی تھیں کہ ڈاکٹر آذر ہیڈ نرس مسز گپتا کے کیبن میں آیا اور اچانک ہی انہیں آپریشن کے سلسلے کی تیاری کرنے کو کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

ادھیڑ عمر مسز گپتا فوراً ہی کچھ سمجھ نہیں پائی تھیں۔ وہ ہکا بکا کچھ دیر آذر کے چہرے کو تکتی رہی تھیں۔ پھر اپنی اسسٹینٹ کیرتی چودھری کو ساتھ لے کر آپریشن روم میں چلی گئی تھیں۔ وہ آذر سے پوچھنا چاہ کر بھی کچھ پوچھ نہیں سکی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک اس آپریشن کا فیصلہ آذر نے کیسے کر لیا اور یہ آپریشن وہ اکیلے کیسے کرے گا؟ ثمینہ کا کیس تو بالکل ہی الگ قسم کا ہے اس کے کلیجے کو غلطی نہیں بلکہ کسی جیتے جاگتے دل کی ضرورت ہے۔ اور دل جیسی چیز اسے کہاں سے حاصل ہو سکتی تھی؟ بلاشبہ یہ آذر کا دماغی خلل ہی تھا۔ لیکن مسز گپتا چاہ کر بھی آذر کو کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ اور رات ہی رات ثمینہ کا آپریشن ہو

گیا۔ثمینہ کے آپریشن کے تیسرے دن ملک کے سب سے بڑے ہرٹ اسپیشلسٹ جو ان دنوں باہر ملکوں کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔لوٹ کر آئے تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

ثمینہ کے سینے میں ایک جیتا جاگتا دل کیسے پیدا ہو گیا یہ عقدہ ان کے لئے بھی لاینحل تھا ایک چھوٹے سے ڈاکٹر نے ان کے سامنے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا ایک انہونی ہونی بن گئی تھی۔کیا یہ سب اس بے پناہ پیار کی طاقت تھی؟

لیکن انہیں اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے چکنے کے بعد آذر اداس کیوں رہتا ہے کیا ابھی تک اسے اپنی کامیابی کا یقین نہیں آسکا ہے؟

کچھ ہفتوں بعد ثمینہ ٹھیک ہو کر اپنے گھر لوٹ گئی تھی۔

اس بیچ ڈاکٹر آذر کی بڑی بڑی تصویریں اخباروں کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھیں۔اس کے متعلق بڑے بڑے قلم کاروں نے جی جان لگا کر بڑے بڑے مضامین لکھے تھے۔ان سب کے باوجود وہ خاموش دکھائی دیتا تھا۔کوئی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ ہلکے سے مسکرا کر ٹال دیا کرتا تھا۔

ثمینہ کو گھر لوٹے اب تقریباً تین مہینے ہو گئے تھے لیکن نئی زندگی پانے کے بعد گھر والوں نے اس کی فطرت میں بدلاؤ محسوس کیا تھا۔ہر دم چہکتی رہنے والی ثمینہ اب خاموش رہا کرتی تھی۔اور قبرستان کے نام سے ڈرنے والی لڑکی کو اب قبروں سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ہر روز وہ اپنی بالکونی میں کھڑی تھوڑی دور آگے بنے انگریزوں کے قبرستان کی طرف تکتی رہتی تھی۔اس قبرستان میں بالکل سامنے ایک تازہ قبر بنی ہوئی تھی۔

ایک رات وہ اس طرح بے چین تھی نینداس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔اس لئے وہ کچھ پڑھنے کے خیال سے آذر کی لائبریری میں چلی گئی وہاں الماریوں میں ان گنت کتابیں رکھی ہوئی تھیں ثمینہ کوئی ایسی کتاب ڈھونڈنے لگی جس سے تھوڑی تفریح

ہو سکے اور ذہن کا بوجھ ہلکا محسوس ہو۔

اچانک دل کی بیماریوں سے متعلق ایک کتاب اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گئی۔اس کے اوراق بکھرے بکھرے سے ہو گئے۔ثمینہ نے کتاب اٹھا کر اس کے اوراق سیدھے کیے کتاب سے نکل کر گرا ہوا ایک لفافہ پاس ہی پڑا ہوا تھا۔اس نے لفافہ اٹھا لیا۔ اٹھانے پر اسے لگا کہ اس کے اندر تصویر جیسی کوئی چیز ہے۔

اس نے لفافے سے وہ تصویر نکال لی اور اسے دیکھنے لگی۔تصویر کے ساتھ ہی ایک چھوٹا خط بھی تھا جو کسی ماں نے اپنے بیٹے کے نام لکھا تھا جس میں کام کی تلاش میں شہر آئے اپنے بیٹے کے لیے کامیابی کی دعائیں اور بیمار باپ کا حال اور بارش سے مکان کی ایک دیوار گر جانے کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔

ثمینہ کو تصویر کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔اس نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اور اسے پھر یاد آ گیا۔یہ شخص کچھ مہینے پہلے اس کے بابا کے پاس نوکری کے لئے انٹرویو دینے آیا تھا لیکن اس سے ایک دن پہلے ہی اس کے بابا کو اچانک کسی ضروری کام سے باہر جانا پڑا تھا۔ س لئے انٹرویو کی تاریخ کسی وجہ دوسرے دن رکھ دی گئی تھی۔لیکن نہ جانے کیوں وہ پھر نہیں آیا تھا ثمینہ کو اکثر اس کی معصوم صورت کی یاد آتی تھی اس واقعے کے دو مہینے بعد ثمینہ اور آذر کی منگنی ہوئی تھی اور منگنی کے دن ہی ثمینہ کے ساتھ یہ حادثہ گزرا تھا پھر اس کے بعد وہ تین مہینے ہسپتال میں رہی اب گھر لوٹے بھی اسے تین ماہ کے لگ بھگ ہونے آئے تھے۔اور آج یہ تصویر اچانک ہی اسے مل گئی تھی اس لڑکے کا نام جوزف تھا اور اس کی ماں اسے جوزی کے نام سے پکارتی تھی۔یہ بات س لڑکے نے ہی بتائی تھی۔

ثمینہ کو اچانک ڈاکٹر آذر کی آواز سنائی دی تو ثمینہ اپنے سوچوں کی دنیا سے باہر نکل آئی اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس ٹھنڈے موسم میں بھی اسے آذر کی پیشانی

پر پسینے کی بوندیں چمکتی دکھائی دیں۔ اس کا چہرہ ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک پل کو ثمینہ ڈر گئی اس کی کیفیت دیکھ کر اسے لگا کہ آذر کو دل کا دورہ پڑنے والا ہے کچھ لمحوں بعد آذر سنبھلا تو ثمینہ نے اس کی طبیعت اور اس تصویر کے بابت پوچھا تو آذر نے اس سے ہی سوال کر ڈالا کہ کیا وہ اسے جانتی ہے؟ تب ثمینہ نے اس کے متعلق جو وہ جانتی تھی بتا دیا۔ اب ڈاکٹر کی بے چینی ور بڑھ گئی کئی دن وہ بیحد پریشان رہا۔ پھر ایک رات جب ثمینہ بالکونی میں کھڑی اس قبرستان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

یہ رات وہ رات تھی جب تمام قبروں پر ان کے رشتے دار موم بتیاں جلانے آئے تھے۔ تمام قبروں پر موم بتی جل رہی تھیں صرف ایک قبر ایسی تھی جس کے سرہانے کوئی روشنی نہیں تھی ثمینہ اسی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اچانک آذر اس کے پاس کھڑا ہو گیا ڈ کٹر کو اس وقت وہاں پا کر ثمینہ کچھ حیرات سی ہو گئی۔ کیونکہ یہ وقت اس کی اسٹیڈی کا تھا اور آج تک جب سے وہ اسے جانتی تھی اس کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

لیکن آج وہ بہت پریشان معلوم ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی چٹھی دبی ہوئی تھی۔

تم نے یہ خط پڑھا تھا؟ آذر نے پوچھا تو ثمینہ نے ہاں کہا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھ بیٹھی کہ ”تم اس خط کو لے کر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟

تب آذر نے ثمینہ کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔

”تم نے س دن اس لڑکے کے بارے میں پوچھا تھا نا؟

ثمینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ چپ چاپ آذر کا منھ تکتی رہی۔ ”سنو! ....ڈاکٹر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کیا تم اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں پا رہی ہو؟“

''ہاں مجھے اپنا بہت کچھ بدلا بدلا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔'' ''ہاں ثمینہ شاید ہم دونوں بدل گئے ہیں۔''

''لیکن اس کی وجہ کیا ہے؟''

''شاید یہی کہ ہم دونوں کے بیچ وہ آ گیا ہے۔''

''مطلب۔؟'' ثمینہ نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ وہ تمہارے اندر سما گیا ہے۔ ڈاکٹر نے جیسے بہت دور سے کہا تھا۔

''ثمینہ حیرانی سے ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ آزر کا ذہنی توازن کچھ گڑبڑا گیا ہے۔'' ''تم نہیں جانتی وہ کیسا چور چور ہو کر ہسپتال پہنچا تھا کچھ بھی تو نہیں بچا تھا اس کے پاس ایک دل کے سوا ایسے چور چور جسم کے اندر دل کا صحیح سلامت بچ رہنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس کے سارے جسم کی ہڈیاں پس گئی تھیں اور پھر بھی دل اپنی جگہ کام کرتا جا رہا تھا۔ آزر دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

اور میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا تھا تب میں نے تمہیں زندگی دینے کے لئے اس کے دل کی حرکت بند کر ڈالی۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے گناہ کیا یا ثواب اس کا دل اگر اس کے سینے میں دھڑکتا بھی رہتا تو کسی کام کا نہیں ہوتا۔ اور تم بغیر دل کے موت کی گھڑیاں گن رہی تھیں۔ تب میں نے ...... لیکن مجھے سکون نہیں گرچہ تم زندہ۔ سلامت میرے سامنے موجود ہو لیکن میں بے چین ہوں۔ مجھے کہیں چین نہیں ہر پل ہر گھڑی میں اسے اپنے سامنے کھڑا محسوس کرتا ہوں ....

''اور ...... اس کی لاش ثمینہ اندر ہی اندر اپنے کو کانپتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''لاش ....؟ آزر نے دھیرے سے کہا ...... بعد میں اس کی لاش .... مطلب یہ کہ اس کی پسی ہوئی ہڈیاں مشن والے لے گئے تھے .... نہیں

معلوم اسے کہاں اور کیسے دفن کیا گیا تھا۔

اس کی ماں جولی ڈیسوزا کے رونے کی آواز شاید تم نے بھی سنی ہو .... تم جب ہسپتال میں تھیں تو وہ.......

کہتے کہتے آذر نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ثمینہ وہاں نہیں تھی چند لمحوں کے بعد اندھیری قبر کے پاس سے جس کے سرہانے کوئی موم بتی نہیں جلی تھی ۔ ایک دردناک چیخ ابھر کر رات کے سناٹے میں گھل گئی۔

☆☆☆☆☆

جھیل، کنول، اور بُگلا

اس نے پھٹی ہوئی گنجی کے ٹکڑے سمیٹے اور انہیں اٹھا کر اسٹور روم کے کونے میں ڈال دیا۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھیں چھلکی چھلکی۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ نغمہ اب یک دم خاموش ہو گئی تھی۔ جیسے دودھ کا ابال آ کر پانی کے ہلکے چھینٹے سے بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال نغمہ کا تھا۔ وہ بہت بار ایسا کر چکی تھی۔ اور ہر بار راحیل نے یہی سوچا کہ وہ اپنے آپ سے لڑ رہی ہے۔ ہر لڑائی کے بعد راحیل نے اس کے حق میں دعا مانگی تھی کہ وہ خود سے خود کی جنگ جیت جائے۔

اس کے گال تھپتھپا کر وہ باہر نکل آیا اور صحن میں آ کر اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔

"خدایا اسے فتح بخش"

نغمہ اپنے ماں باپ کی اکیلی بچی تھی لیکن اس کی ماں اس کی پیدائش کے وقت ہی گزر گئی تھی۔

راحیل کے والدین بھی ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے تب نغمہ کے ابو راحیل کو

اپنے ساتھ لے آئے تھے دونوں کی پرورش ساتھ ہی ہوئی تھی۔ لیکن راحیل بڑا ہو کر پڑھائی کے لئے باہر بھیج دیا گیا تھا اور اب ایک فوجی ڈاکٹر بن کر لوٹا تھا۔

نغمہ کے ابو فاریسٹ افسر تھے۔ اور پیڑ پودوں کو بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جایا کرتے تھے۔

نغمہ کی ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے لوگوں کے بہت کہنے پر بھی دوسری شادی نہیں کی تھی۔

نغمہ کی دیکھ بھال کے لئے وہ ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ عورت کو لے آئے تھے۔ جو نغمہ کے ننھیال کی تھیں انہوں نے نغمہ کی ماں کا بچپن بھی دیکھا تھا۔ نغمہ انہیں "تائی کہہ کر بلاتی تھی۔ جب کہ ننھیالی رشتے سے وہ اس کی نانی لگتی تھی۔

ایک دن نغمہ کے بابا کو خبر ملی کے جنگل کے کچھ بے حد قیمتی درختوں کو چرا کر اسمگل کرنے کا پروگرام کچھ لوگوں نے بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے اسی دن سے اپنا ڈیرہ جنگل میں ڈال لیا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ رات اندھیری ور بہت ٹھنڈی تھی۔ پہاڑوں پر برف جمی ہوئی تھی۔

جنگل میں چاروں طرف پہرے بٹھا دیئے گئے تھے لیکن ان میں سے دو ایک لوگ درخت چوروں سے ملے ہوئے تھے اور چند سکوں کی خاطر اپنے ملک سے غداری کر رہے تھے۔

نہوں نے ایک سازش رچی اور دوسرے پہرے داروں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ

ایسی گھنی اندھیری ٹھنڈی رات میں جنگل میں آنے کی ہمت کوئی نہیں کرے گا اس لئے آپ لوگ تھوڑا آرام کرلیں۔ تب تک ہم جاگتے ہیں۔ کسی قسم کی آہٹ ہوئی تو آپ کو جگا دیں گے۔

ٹھنڈ سے ٹھٹھرتے لوگوں کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ نیند کی

دوا ملی ہوئی شراب نے رنگ دکھایا اور وہ لوگ گہرے نیند میں ڈوب گئے۔ سوائے ان دو لوگوں کے۔ کیونکہ انہیں نیند اور ٹھنڈ سے بچانے کے لئے ان کی جیب میں پڑے نوٹوں کے بنڈل موجود تھے۔

آدھی رات کا وقت ہوگا جب فائلوں کے انبار میں چھپے کانوں سے آری چلنے کی ہلکی ہلکی سی آواز آئی اور وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔ کھونٹی پر ٹنگا اوورکوٹ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور ہاتھ میں ٹارچ لے کر باہر نکل آئے۔

پہرے داروں کو بلانے کی سیٹی بجائی لیکن انہیں جواب نہیں ملا۔ تب وہ خود اس طرف چل دیئے جدھر سے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اور خزاں کے مارے سوکھے پتے پیروں کے نیچے دب کر چرمرکر رہے تھے۔

چار سائے ایک درخت سے کود کر بھاگے انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں انہیں دیکھنا چاہا لیکن عین اسی وقت اس درخت کی موٹی سی ڈال چرچرا کر دھڑام سے گری۔ گہرے سناٹے میں ایک آہ گونجی تین چوتھائی کٹا ہوا درخت کا تنا ہوا کے تھپیڑے سہ نہیں سکا تھا اور ٹوٹ گیا تھا۔

جب نغمہ کے بابا اس حادثے کا شکار ہوئے اس وقت راحیل گھر آیا ہوا تھا صبح کا ذب کے وقت جب انہیں وہاں سے اٹھا کر ہاسپٹل لے جایا جارہا تھا تو اپنی بچی ہوئی چند سانسوں کو مٹھی میں پکڑ کر راحیل کے ہاتھ سے نغمہ کی انگلیوں میں منگنی کی انگوٹھی ڈلوا کر انہوں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

چند مہینوں پہلے بوڑھی تائی بھی داغ مفارقت دے چکی تھیں نغمہ ایک غم سے ابھر بھی نہ پائی تھی کہ یہ ایسا گہرا زخم لگا جو مدتوں نہ بھر سکا تھا۔

اب گھر میں راحیل، نغمہ اور چند نوکروں کے سوا کوئی نہیں بچا تھا۔

تائی نغمہ کو بہت پیار کرتی تھیں۔ اسے روز نئی نئی کہانیاں بھی سناتی تھیں۔ اس کے بال سنوار کر لمبی لمبی دو چوٹیاں گوندھ دیا کرتیں اپنے سے کھانا کھلاتی تھیں۔

اس وقت نغمہ کی عمر کوئی بارہ برس کی رہی ہوگی جب ایک رات پورے چاند کی رات میں وہ تائی کے ساتھ اپنے باغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ شروع بہار کے دن تھے۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی نغمہ تائی سے کہانی سنانے کی ضد کر رہی تھی۔ کہ اس کی نظر ایک سفید رنگ کی چڑیا پر پڑی اس چڑیا کی چونچ گلابی اور پیر بھی گلابی تھے آنکھیں سرخی مائل چمکیلی تھیں وہ اوپر سے اچانک ہی نیچے باغ میں بنے حوض پر آ گری تھی۔ وہ پھر اڑی اور اوپر جا کر چاند کے چاروں طرف چکر لگانے لگی وہ چکر لگاتی جاتی اور ساتھ ہی درد بھری آواز میں پکارتی جاتی تھی۔

اس طرح کچھ ہی دیر میں وہ کئی بار گری اور پھر اڑی تھی۔ اور چاند کے گرد چکر لگا رہی تھی۔

''تائی یہ چڑیا چاند کے پاس کیوں جانا چاہ رہی ہے؟ کیا وہ چندا ماما کو اڑن طشتری سمجھ کر اور اس پر بیٹھ کر کسی دوسرے سیارے پر جانا چاہتی ہے؟

نغمہ کی بات سن کر تائی کو ہنسی آ گئی تھی۔

تائی کی ہنسی نغمہ کو بہت پیاری لگتی تھی۔ اس نے دوبارہ تائی سے یہی سوال کیا۔

''بولئے نہ تائی! یہ چڑیا بار بار گر کر بھی اوپر جانے کی کوشش میں کیوں لگی ہوئی ہے؟

''یہ اس لئے چاند کے پاس جانا چاہ رہی ہے کہ یہ چاند کو بہت پیار کرتی ہے''۔ تائی نے جواب دیا۔

''چاند اس کی تائی لگتی ہے کیا؟'' نغمہ نے معصومیت سے پوچھا۔ کیونکہ اس کی نظر میں پیار کرنے والی کوئی بھی شئے، تائی اور بابا ہی ہو سکتی تھی۔

تائی ایک بار پھر ہنس دیں۔ ان کی ہنسی نغمہ کو پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگی۔

''وہ اس کی تائی نہیں بلکہ اس کا پریمی ہے'' تائی نے کہا۔ یہ اس کے پاس جانا چاہتی ہے لیکن جا نہیں سکتی۔ کیونکہ چاند بہت دور ہے۔ یہ ساری رات اس کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے اور صبح تک نڈھال ہو کر گر جاتی ہے۔ پھر اگلی رات یہ کوشش دوہراتی ہے۔ آخر

ایک دن چاند چھپ جاتا ہے کیونکہ اسے بھی قدرت کے قانون کے مطابق ابھرنا اور ڈوبنا ہوتا ہے وہ نیچے نہیں آسکتا۔ اور یہ اوپر نہیں پہنچ سکتی۔

پھر ایک رات تائی نے اسے ایک شہزادی کی کہانی سنائی تھی جو اپنے بادشاہ باپ کے محل کے ایک شاعر سے پیار کرنے لگی تھی وہ بھی اسے پیار کرتا تھا۔ لیکن وہ غریب تھا۔ اس لئے شہزادی سے پیار کرنے کے جرم میں اسے محل سے نکال دیا گیا۔ اور وہ بے چارا بھوکا پیاسا محل کی چوکھٹ سے باہر پڑا ٹھنڈی برفیلی ہوا کے جھونکے سہتا ہوا ایک دن مر گیا۔ تائی نے اس انداز سے نغمہ کو یہ کہانی سنائی کہ نغمہ کی آنکھوں میں آنسو گئے تھے۔ اور پھر وہ تائی سے پوچھ بیٹھی۔

''تائی کیا آپ بھی کسی سے پیار کرتی تھیں؟''

''نہیں ری میں کیا جانوں پیار کیا ہوتا ہے۔ میری شادی تو نو برس کی عمر میں ہوگئی تھی اور گیارہ برس کی ہوتے ہوتے میرا دولہا فسادوں میں مارا گیا۔ میں نے تو اپنی سسرال بھی نہیں دیکھی۔ میرے میکے میں بھی کوئی نہیں بچا تھا تب تیرے نانا مجھے اپنے گھر لے آئے۔ میں تیری ماں کی خدمت میں لگ گئی میں نے بھی تو بس یہ کہانیاں سنی ہیں۔ ہاں اگر تیری ماں زندہ ہوتی..........تو تائی کہتے کہتے رک گئیں۔

لیکن نغمہ نے ضد کر دی۔ اپنی قسم دے ڈالی ''بتایئے نہ تائی، کیا میری امی بھی کسی کو پیار کرتی تھی؟''

''ہاں'' ۔تائی نے نغمہ کی قسم سے مجبور ہو کر کہنا شروع کیا۔

''تیری ماں کو بھی کسی سے پیار ہوا تھا لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ تیرے نانا کے پاس شہزادے جیسا داماد خریدنے کو پیسے نہیں تھے۔ اور تیری ماں کو تیرے بابا سے بیاہ دیا گیا۔ تیرے بابا تو تو جانتی ہی ہے کتنے اچھے تھے۔ وہ تیری ماں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن نہ جانے تیری ماں کو کون سی بیماری لگ گئی تھی کہ شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہی تیری پیدائش میں تیری ماں ....''

تائی کا گلا بھر آیا۔

اس کہانی کے سنتے ہی نغمہ نے ایک فیصلہ لے لیا تھا کہ وہ اسی سے شادی کرے گی جسے خوب پیار کرتی ہو۔ اس کے ننھے سے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی ماں اس لئے مرگئی کہ وہ جسے پیار کرتی تھی اس سے اس کی شادی نہیں ہوسکی جیسے وہ شاعر مر گیا تھا۔ اور جیسے یہ چڑیا مر جائے گی۔ نغمہ اپنی بیٹی کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

کئی سال ہوگئے تھے اس بات کو، نغمہ کی عمر اٹھارہ برس کی ہو آئی تھی لیکن وہ کہانی اب تک اس کے ذہن و دماغ پر چھائی تھی۔

راحیل کو دیکھ دیکھ کر اسے اس پر ترس آتا تھا۔ وہ سوچتی کاش اسے راحیل سے محبت ہو جاتی۔ کیونکہ جب تک پیار نہ ہو وہ شادی نہیں کرسکتی تھی۔ اپنا جنون ٹھنڈ ہو جانے کے بعد وہ ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعا بھی مانگا کرتی تھی لیکن اس کے خیال میں اسے راحیل سے اب تک محبت نہیں ہوسکی تھی۔

تائی نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ۔

''جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو پورے چاند کی رات میں سامنے والی پہاڑی کے اوپر والے مندر میں اپنے آپ ہی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ یہ مندر صدیوں پرانا تھا۔ اس مندر کی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی پوری وادی میں نغمے گونجنے لگتے ہیں۔

اور جھیل میں سنہرا کنول کھل جاتا ہے۔ آسمان میں اڑنے والے بگلے کے سفید ریشمی پر کنول کے سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

نغمہ نے اکثر کان لگا کر پورے چاند کی راتوں میں اس مندر کی گھنٹیاں سننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے کوئی گھنٹی سنائی نہیں دی تھی۔ نہ اس نے اب تک بگلے کے سفید پر کو سنہرے کنول کے سینے میں سماتے دیکھا تھا۔ جب کہ ٹھیک اس کے کمرے کی کھڑکی کے سامنے والی جھیل میں ہر روز گلابی سفید کنول کے پھول کھلا کرتے تھے۔ اور مندر والی پہاڑی بھی ٹھیک اس کے گھر کے سامنے کچھ ہی دوری پر تھی۔

نغمہ کا انتظار انتظار ہی رہا اور سرحد پر ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی ۔ راحیل کو اپنی ڈیوٹی پر جانا پڑا۔ جانے سے کچھ پہلے وہ پاس کے گاؤں کی ایک بوڑھی عورت کو نغمہ کے ساتھ رہنے کے لئے لے آیا تھا۔

اور رخصتی کے وقت اس نے نغمہ کے گھنے گھنے بالوں والے سر کو سہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"نغمہ میرے واپس آنے سے پہلے اگر تمہیں کسی سے محبت ہو جائے تم اسے ٹوٹ کر چاہنے لگو، نیلی جھیل میں سنہرا کنول کھل جائے اور بگلے کا سفید پر کنول کے سینے میں سما جائے ۔ اور پورے چاند کی رات کو پہاڑی مندر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ تو تم اسے ضرور اپنا لینا۔"

پھر ایک دن نغمہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ شہر گھومنے گئی تھی وہاں ایک آرٹ گیلری میں اس نے ایک تصویر دیکھی ۔ یہ تصویر بالکل ویسی ہی تھی جیسی نغمہ کے تصور میں بارہ سال کی عمر سے بسی ہوئی تھی۔

نیلی جھیل میں کھلا ہوا سنہرا کنول ۔ اس کے بہت اوپر آسمان کے نیچے اڑتا ہوا سفید بگلا جس کا ایک پر ٹوٹ کر سنہرے کنول کے سینے میں سمایا ہوا تھا۔

تب نغمہ نے اس تصویر کے خالق کو ڈھونڈھنے کی ضد کی اور آخر کار اسے ڈھونڈھ ہی لیا۔

وہ اسی گیلری کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا خاموش اور اداس نغمہ اور اس کی سہیلیوں نے اس سے بات چیت کرنی شروع کی، اس تصویر کی تعریف کی اور اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ بات چیت کے دوران اس نے کہا تھا کہ وہ ان گل پوش وادیوں کی تصویر بنانا چاہتا ہے۔ پھر وہ ان ہی لوگوں کے پیچھے وادی میں چلا آیا نغمہ نے اپنے گھر کا ہی ایک کمرہ اس کے رہنے کے لئے ٹھیک کروادیا۔

پھر اس نے نغمہ کی ایک تصویر بنانی شروع کردی۔ نغمہ کو لگا کل رات پہاڑی مندر

کی گھنٹی بجی ہو گی وادی میں نغمہ گونجے ہوں گے۔

لیکن چند ہی دنوں بعد اس کا یہ بھرم جاتا رہا۔ وادی میں نغمے اب تک نہیں گونجے تھے۔ مندر کی گھنٹیاں نہیں بجی تھیں۔

کئی موسم آکر چلے گئے۔ نغمہ کے بالوں پر برف جمنے لگے۔

''مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہو سکتی'' اب مجھے مر جانا ہے، نغمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مصور دوسرے کونے میں ایک کینواس لگائے ایک تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ ''کون آیا ہوگا اس وقت؟'' نغمہ چونک گئی اور مصور کے ہاتھ رک گئے۔ شاید کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہو!''

ذرا رک جاؤ کہیں یہ تمہارا وہم نہ ہو، مصور نے کہا۔

''جب تک تین بار دستک نہ سن لو دروازہ نہ کھولنا۔''

بوڑھی انا نے تنبیہ کی۔ اور ٹھیک اسی وقت تیسری بار دستک ہوئی اس بار کی دستک پہلے سے زیادہ واضح تھی۔

''اب یہ تصویر آج بھی پوری نہ ہو سکے گی'' مصور بڑبڑایا۔ پھر اس نے برش رکھ دیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ نغمہ کو اس نے اپنے پیچھے کر دیا تھا۔

بوڑھی انا نے چراغ کی لو تیز کر دی۔ اور آنے والا بڑی اپنائیت سے اندر چلا آیا۔ اور اپنی برف سے ڈھکی ٹوپی اتار ڈالی دھیرے سے مسکرایا۔ مصور کی طرف دیکھا پھر نغمہ کی طرف۔

''تمہارا انتخاب اچھا ہے نغمہ بہت اچھا۔'' جانی پہچانی آواز نے نغمہ کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

''راحیل........؟!'' وہ چلا اٹھی۔

''ہاں .... نغمہ میں لوٹ آیا ہوں۔''

''لیکن تم اتنے دن کہاں تھے راحیل ..... پلٹ کر میری خبر تک نہ دلی۔ دس سال ...... اف ....''

میں دشمنوں کی قید میں تھا نغمہ .... میں نے تو اپنی پہچان بھی کھودی ہے تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ بارودی دھوؤں نے میرا بہت کچھ چھین لیا ہے۔ میری آنکھیں دھندلی ہوگئی ہیں۔ اور میرے بالوں کا رنگ اڑ گیا ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا نغمہ جو ایک ساتھی ....

اچانک راحیل کو کھانسی آگئی۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ نغمہ دوڑ کر اس کے پاس آگئی اور اس کا سینہ سہلانے لگی۔ مصورے دونوں ہاتھ دعاء کے لئے اٹھادیئے۔

''اے خدا اسے سکون بخش اور اس کے دل میں محبت جگادے۔!''

مصور کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اور آنکھیں چھلک رہی تھیں پھر اس کی آنکھوں سے چند قطریں نکل کر زمین پر ٹپک پڑے۔ شاید سنہرے کنول کے سینے میں بگلے کا سفید پر سما گیا تھا۔

بوڑھی انا نے آتشدان کی آگ تیز کردی تھی مصور نے اپنے کینواس پر پردہ ڈال دیا تھا۔

برف باری اس رات شباب پر تھی۔ اس کے کمرے میں آتشدان روشن تھا۔ بوڑھی انا اپنے دامن میں انگیٹھی سمیٹے سکڑی سمٹی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ نغمہ آتش دان سے نھتی آگ کی لپٹوں کو گھور رہی تھی، اور راحیل کا سر نغمہ کے شانوں پر ٹکا ہوا تھا نغمہ اس کا سینہ سہلاتی جارہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسوں نکل نکل کر راحیل کے سفید بالوں کو بھگو رہے تھے۔

اب برف باری تھم گئی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ چاند نے بادلوں کے پیچھے سے جھانکا۔ اور ٹھیک اسی وقت پہاڑی مندر کی گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔

☆☆☆

فسانۂ شب تار

شام ڈھلے کھیتوں پر کام بند ہو گیا تھا۔ اور تمام کسان اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ان دنوں شام جلدی گھر آتی تھی اور راتیں لمبی ہو گئی تھیں۔

لمبی اور ٹھنڈی رات کی چاندنی جب آنگن میں اُتر آتی تھی تو دن میں اُداس دکھائی دینے والا ماحول ایک دم سے چنچل ہو اٹھتا تھا۔ آنگن میں الاؤ جل اٹھتے تھے اور ان کے گرد بیٹھے ہوئے ضعیف لوگ اکٹھے ہو کر حقوں کی گُڑگُڑاہٹ کے ساتھ بیتے دنوں کی یاد تازہ کیا کرتے تھے! اور چھوٹے بچے اپنی دادیوں اور نانیوں کی گود میں گھُس کر کہانیاں سننے کی ضد کرنے لگتے اور الھڑ لڑکیاں آنگن کے اس چھور سے اُس چھور تک کود کود کر آنکھ مچولی کھیلا کرتیں۔ ایسی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلنے کا مزا ہی کچھ اور ہوتا تھا!

مائیں اپنی اپنی بیٹیوں کو کاندھوں پر شالیں ڈالنے کے لئے ڈانٹ ڈانٹ کر تھک جایا کرتیں۔ اور پھر کھانا پکاتے، لکڑیاں جلاتے اپنی اپنی یادوں کے دریچے کھول لیتیں۔ جب وہ بھی ان لڑکیوں کی طرح چنچل اور لاپروہ ہوا کرتی تھیں۔ اور ایسے میں کوئی بہیلیا آ کر جال ڈال جاتا تھا' اور ہنستے'' ان معصوم چہروں پر سنجیدگی کا غلاف چڑھا لینے پر مجبور کر جاتا تھا!

اور سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی ان کی معصوم مسکراہٹیں اُبلتے ہوئے دھان اور ان کے نیچے جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کے نیچے دب جایا کرتیں!

کہیں کبھی آنسو کی کوئی بوند ٹپکتی بھی تو گرم راکھ پر ٹپک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جایا کرتی! پھر ان کا اپنا کچھ بھی تو نہیں بچتا تھا۔ ان کے آنسو ان کی ہنسی سب کچھ دوسروں کی قرض دار ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے لئے نہ ہنس سکتی تھیں، نہ رو سکتی تھیں!

ایسی ہی ٹھنڈی چاندنی میں نہائی ہوئی ایک رات میں ایک دوشیزہ اپنے آنگن میں اپنی ننھی سی بھانجی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ اس کا بوڑھا باپ صبح دریا پر جانے کے لئے اپنے جال کے بند کس رہا تھا اور اس کی ماں چولہے کے پاس بیٹھی گیلی لکڑیوں کو پھونک پھونک کر جلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی اور اس کے بالوں میں چولہے سے اڑتی ہوئی راکھ تہہ در تہہ جمتی جا رہی تھی۔

باقی کا سارا کام اس دوشیزہ نے شام ڈھلے ہی نپٹا دیا تھا۔ لیکن اسے روٹیاں سینکنی نہیں آتی تھی۔ یوں بھی وہ یہاں کچھ ہی دنوں کی مہمان تھی۔ کیونکہ وہ کنواری نہیں تھی۔ اس کے جسم پر سہاگنوں کا لباس تھا اور اس کے گھنے گھنے بالوں کے بیچ سیندور کی ہلکی سی لکیر چمک رہی تھی جسے چھپانے کے لئے اس نے اپنے بالوں کو پٹ کر کنگھی کی تھی۔

اس کی عمر کوئی پندرہ سولہ برس کی رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔ اس کے رخسار گلابی تھے۔ اور اس کی آواز سریلی تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنی بہن کی بیٹی کے ساتھ کھیلتے کھیلتے ایک دل نشیں گیت گنگنا رہی تھی۔ اسی وقت اچانک دروازے پر ایک آہٹ سنائی دی۔ کسی نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ روٹیاں سینکتی اس کی ماں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا اور بوڑھے مچھوارے کو مخاطب کرتے ہوئے دھیرے سے بولی "اس ٹھنڈی اندھیری رت کو ہمارے دروازے پر کس نے دستک دی؟

"شاید کوئی بھولا بھٹکا راہی ہو"۔ مچھوارے نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جال ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اور اپنی دکھتی ہوئی کمر کو پکڑ کر اٹھا اور دروازے کے قریب جا کر لکڑی کا کھٹکا کھول دیا۔ اس وقت اس نے ایک ہاتھ سے لالٹین اونچی کر رکھی تھی تاکہ آنے

والے کا چہرہ دیکھ سکے۔ کھٹکا کھلتے ہی دروازہ ہوا کے زور سے اپنے آپ کھل گیا۔ اور تب بوڑھے کے منہ سے اچانک ہی نکل گیا:

''ارے بیٹا تم۔؟ اس وقت، اچانک......؟''

''کون ہے؟'' ماں نے دروازے کی طرف رخ کیا ور آنکھیں سکوڑ کر آنے والے کو پہنچاننے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ میں ہوں ماں!'' آنے والے نے جھک کر اسے سلام کیا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

ماں نے آٹا لگے ہوئے ہاتھ کو ہی اس کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا: ''اس وقت اچانک کیسے آنا ہوا بیٹا؟ کوئی ضروری کام؟''

بوڑھی عورت کے اس سوال پر اس نوجوان نے جس کے جسم پر جہازی فوجی لباس بڑا جچ رہا تھا اس کے گھنگھرالے بال اس کی چمکیلی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے وہ قد آور اور بڑا مضبوط معلوم ہوتا تھا کہا

''میں یہاں صرف دو گھنٹے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا ہے۔ اور میری ماں اکیلی ہے اور اپنی بہو کے لئے ضد کر رہی ہے میں انشو کو لینے آیا ہوں۔''

''اچانک اس وقت؟''۔ ماں پریشان ہو اٹھی'' کیا آج رات بھر بھی نہیں رکو گے؟.... ویسے بھی ابھی انشو کی رخصتی کے سلسلے کا انتظام باقی ہے۔ ہم غریب لوگ'' کہتے کہتے اس نے شوہر کی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے نوجوان سے کہا: ''بیٹے، ابھی مناسب نہیں!'' ایسا کہتے ہوئے بوڑھے کے کان آنگن کی طرف لگے ہوئے تھے جہاں اب گہرا سناٹا چھا چکا تھا۔ نغمے خاموش ہو گئے تھے اور ہنسی کی چہلیں کہیں کھو گئی تھیں۔

''میں نے آپ سے کبھی کچھ مانگا تو نہیں بابا۔ نہ میری ماں نے ہی کوئی مانگ کی ہے۔ وہ تو بس یہی کہتی ہیں کہ اگر تمہاری بات سچ ہے اور تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے

ہو تو بہو کو گھر لے آؤ' ' میری ماں نے اپنی بہو کے لئے بہت سے سپنے سجا رکھے ہیں۔ آرتی کی تھالی سنوار رکھی ہے اور اس کے انتظار میں دروازہ کھولے بیٹھی ہوئی ہے۔''

''جانتا ہوں بابا کہ مجھے سامنے پا کر اس کے گیت کہیں کھو جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے ڈرتی ہے۔ یا کوئی اور بات اسے میرے قریب آنے سے روکتی ہے۔ لیکن میں نے بارہا یہ بھی سوچا ہے کہ وہ ابھی کمسن ہے اور دھیرے دھیرے زندگی کی ضرورتوں کو سمجھ جائے گی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہوا!۔'' بوڑھے باپ نے دعا کے لئے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے۔

اب آدھی رات ہونے کو تھی۔ چاند دھیرے دھیرے ڈھلتا جا رہا تھا۔ ہوا کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ اور ایک کشتی دریا کی لہروں پر ہولے ہولے رواں تھی۔

پتوار چلانے والے اس نوجوان نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی دوشیزہ سے پوچھا تمہیں یاد ہے وہ رات جب دریا کے کنارے میرا جہاز آ کر رکا تھا...... اور تم عرشے پر کھڑی چاندنی رات میں دریا کی مچلتی ہوئی لہروں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔ اس وقت میں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور تم مجھے دیکھ کر کچھ ڈر سے گئے تھے''۔ ''میں سچ مچ ڈر گیا تھا۔ رات کا سناٹا، دریا کا کنارہ اور ایسے میں سفید لباس میں ملبوس ایک سایہ جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور ہوا سے اڑتا ہوا اس کے دوپٹے کا لمبا سا سرا .... میں نے تو سمجھا تھا آسمان پر اڑتا ہوا کوئی فرشتہ اچانک ہی راستہ بھول کر نیچے اتر آیا ہو..... '' وہ اپنے آپ ہی ہنس پڑا!

دوشیزہ نے اس کی ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے اس نوجوان کی ہنسی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی تھی۔ ''انشو! تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولتیں کیوں نہیں؟'' جواب میں انشو نے اس کے ہاتھ سے پتوار لے لی اور کشتی کھینے لگی۔

''کیوں؟ کیا ہوا، انشو؟'' نوجوان نے پھر پوچھا تو جواب میں انشو نے

سر جھکائے جھکائے ہی کہا.

''میں اپنی کشتی خود کھینا چاہتی ہوں مارلو!''

''کیوں کیا میں صحیح کھیون ہار نہیں؟'' مارلو نے ہنس کر پوچھا تو وہ بول اٹھی:'' شاید ایسا ہی ہے!''

انشو نے یہ بات بڑی سنجیدگی سے کہی تھی۔ اور اب مارلو کی ہنسی نہ جانے کہاں کھو گئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر خشکی ابھر آئی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا: کیا سچ کہہ رہی ہو انشو؟''

''ہاں مارلو! مجھے لگتا ہے تمہارے ساتھ زندگی کی ناؤ نہیں کھینچ سکوں گی۔''

''کیا؟'' نوجوان کی آواز اس کے گلے میں ہی رک گئی تھی!'' تب تم نے اس وقت ہاں کیوں کردی تھی جب میں تمہارے گھر اپنا پیغام لے کر گیا تھا۔ تم نے اسی وقت .نکار کیوں نہیں کر دیا تھا....'' کہتے کہتے اس کے ہاتھ پاؤں ایک دم سے ڈھیلے پڑ گئے۔

''شاید روپ ایک وقتی کشش تھی۔'' انشو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اور یہ کہتے کہتے اچانک ایک چھپاکے کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی!

اس نے اپنے سامنے دیکھا'' مارلو وہاں نہیں تھا۔ اور کشتی ٹھیک دریا کے بیچ ہچکولے کھا رہی تھی۔

پتوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا.... اور اب کشتی دریا کے لہروں کے رحم و کرم پر ڈولتی چلی جا رہی تھی۔

انشو نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھکے ڈھکے ہی اپنے آپ سے کہا۔۔'' تم نے بہت جلدی کر دی مارلو! آگے کی بات نہیں سن سکے۔ میں نے تمہیں جو کہا تھا اس کے آگے یہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ کشتی جب تک دریا کے اس پار پہونچے تب تک شاید میرے دل میں تمہارے لئے پیار جگ اٹھے! یا تمہاری چوکھٹ پر پہونچتے پہونچتے تمہاری ماں کا سلوک میرے دل میں آرتی کے دیئے کی طرح پیار کی لو کو روشن کر دے۔''

چاند نے کہیں دور بادلوں میں اپنا منہ چھپ لیا تھا اور سارے ماحول کو اندھیرے نے اپنی کالی چادر اوڑھادی تھی۔ اچانک دریا کی لہروں نے پلٹا کھایا۔ دریا میں بھنور اٹھنے لگے اور اس بھنور میں وہ ننھی کی کشتی جانے کب تک چکراتی رہی۔ اور چکراتے چکراتے دریا میں ابھری ہوئی دو کالی چٹانوں کی درار میں جا کر پھنس گئی اور پانی کے زور سے چٹانوں کی دیواروں سے ٹکر کھانے لگی۔

اور صبح کو جب طوفان تھما تو کشتی کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں تھا بس چند تختے دریا کی لہروں پر انجانی منزل کی تلاش میں بہتے چلے جا رہے تھے!

☆☆☆☆☆

چھلے ہوئے گھٹنے کا درد

گرمیوں کی ایک چلچلاتی دوپہر میں وہ اپنے ہاتھوں میں ایک پوٹلی سنبھالے اور سر پر مٹی کی چھوٹی سی مٹکی رکھے پہاڑی کے اس پار کھیتوں کی طرف چلی جا رہی تھی۔

چاروں طرف لو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ اور پتھریلے راستے تپ رہے تھے۔ لیکن وہ ان پتھریلے راستوں پر ننگے پیر چلتی جا رہی تھی۔

ہائے کتنی دھوپ چڑھ گئی ہے۔ صبح سے بھوکا بیٹھا ہوگا ہمرا بڑھوا، اور اپنے بڑھو کے بارے میں سوچتے سوچتے اچانک ہی اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے وہ گر پڑی۔ بے خیالی میں اس کا پیر پہاڑی کی، دراڑ میں جا پھنسا۔ پانی کی مٹکی پھوٹ گئی۔ اور اس کے گھٹنے میں تیز درد کی ایک لہر اٹھی لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ اور مٹکی کے نچلے حصے میں بچ ہو تھوڑا سا پانی دوبارہ سر پر رکھا پوٹلی اٹھائی اور پھر اپنے راستے پر چلنے لگی۔ اس کی پرانی ساڑی گھٹنوں کے پاس خون سے بھیگ گئی تھی۔

جب وہ کھیت پر پہونچی تو دوپہر ڈھل کر تیسرے پہر میں بدل چکی تھی۔

''آج بڑی دیر کر دی۔ سو گئی تھی کیا؟ اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے پتی نے اس سے پوچھا۔

جواب میں سمری نے پوٹلی نیچے رکھ دی اور مٹکی کا پانی اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اری یہ تجھے کیا ہو گیا سمری؟'' پانی کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے دشرتھ کی

نظر اچانک ہی س کی خون سے بھیگی ساڑی پر پڑی تو وہ اچانک چونک گیا۔ پھر اپنے آپ ہی بولا۔

"تیرے کو تو چوٹ لگی معلوم ہوتی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟"

"راستے میں گر پڑی تھی۔ پاؤں پہاڑی کی دراڑ میں پھنس گیا تھا۔ اصل میں ہوا یہ کہ تمرے کھیت پر آنے کے لئے نکلنے کے ترنت بعد ہم کو جاڑا لگنے لگا تھا۔ بخار آ رہا ہے۔ سو ہم نے سوچا تھوڑی دیر لیٹ رہیں۔ پھر اٹھ کر روٹی پکا لیں گے۔ لیکن ہماری آنکھ، جھپک گئی۔ جب آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ ہڑ بڑا کر اٹھی اپلے تھاپے آنگن لیپا اور تمہارے لئے دو روٹیاں سینکیں اور اچار اور پیاز کے ساتھ لے کر چل دی۔ جلدی پہونچنے کی کوشش میں اور دیر ہوگئی۔ بار بار تیرا خیال آ رہا تھا کہ تو بھوکا بیٹھا ہو گا۔

"تو میری خاطر ہر روز اتنی دھوپ میں اتنی دور سے پیدل چل کر آتی ہے۔ پر کیا کریں۔ آفس کے بابو ہوتے تو ٹفن کا ڈبہ ساتھ لے کر آتے۔ اب اگر تو صبح سویرے روٹیاں سینک کر دے بھی دیتی ہے تو رکھیں گے کہاں؟ یا تو چیونٹیاں چٹ کر جائیں گی یا بانر (بندر) اچک لیں گے۔ پر کیا کریں ہم تو مجبور ٹھہرے۔"

دشرتھ نے اپنے انگچھے کا ایک سرا پھاڑ کر سمری کے زخم پر باندھتے ہوئے کہا۔ تو س کی بات سن کر سمری کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اچھا اب تو جا! اور ہاں جاتے ہوئے ہسپتال سے دوا لیتی جانا۔ کمپونڈر بابو سے کہہ دینا کہ دشرتھ کل صبح آ کر پیسے دے جائے گا۔ اور ہاں رات کا تو کچھ مت کرنا۔ ہم آئیں گے نا تو چار روٹیاں سینک لیں گے تو دوا لگا کر آرام کرنا۔" دشرتھ نے سمری کو تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بڑھؤ ہم آرام کریں گے اور تو دن بھر کا تھکا شام کو روٹیاں بھی سینکے گا۔"

سمری نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن۔ گھر پہونچتے پہونچتے سمری کو تیز بخار نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ بخار دوسرے دن بھی بنا رہا۔ صبح کھیت پر جاتے جاتے دشرتھ نے سمری

کو روٹی لے کر کھیت پر آنے کو منع کر دیا تھا۔ لیکن سمری کا جی نہ مانا اور دوپہر ہوتے ہوتے وہ پھر روٹی کی پوٹلی اور پانی کی مٹکی لے کر کھیت پر جا پہونچی۔ اور تب اس نے دیکھا کہ دشرتھ نہ جانے کہاں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑی لے آیا ہے اور اس کی دھار بنا رہا ہے۔

''ای کا کروگے بڑھؤ؟ سمری نے حیرانی سے پوچھا تو دشرتھ بولا۔ ''اس پہاڑ کو کاٹوں گا۔ اس نے بڑا دکھ دیا ہے تجھے۔''

''پگلا گئے ہو کا؟ تا بڑا پہاڑ۔ ورانگلی بھر کی چھینی اس سے پہاڑ کاٹو گے؟ اور وہ بھی اکیلے۔؟''

''ناری۔ پگلایا نہیں ہوں۔ متھ ٹھیک ہے ہمرا۔ ہم اس پہاڑ کو کاٹ کر تیرے لئے رستہ بنائیں گے۔'' سمری ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔

''مانو یا نہ مانو سچ مچ پگلا گئے ہو تم تو۔'' اسے اس طرح ہنستے دیکھ کر دشرتھ کو اچانک ہی بیس برس پہلے کی سمری یاد آگئی۔ ہنستی اور کھلکھلاتی ہوئی سمری۔ تب اس کے ہاتھ کتنے نرم تھے اور پاؤں کے تلوے بھی کتنے چکنے تھے۔ اچھے کھاتے پیتے گھر کی بیٹی تھی۔ پر ماں باپ گذر گئے۔ تب نہ میکے کا سہارا رہا نہ سسراں کا۔ نہ دھن کا سکھ ملا نہ سنتان کا۔ اوپر والے نے ایک سنتان دی سو وہ بھی بیٹی۔ بارہ برس کی ہوتے ہوتے محلّہ پڑوس والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ تب اسے بیاہ دینا پڑا وہ سسرال چلی گئی۔ اب کتنی اکیلی ہوگئی ہے سمری۔ بیٹا ہوتا تو اسے پڑھا لکھا کر آفس کا بابو بنا دیتا۔ اس کی بہو آتی تو سمری کو پوتے پوتی کا سکھ ملتا۔ اور یہ سمری دشرتھ مجور کی پتنی نہ کہلا کر دھنی رام یا سکھ رام بڑے بابو کی ماتا جی کہلاتی۔

''ارے بڑھؤ! کا سوچنے لگے۔ روٹی سوکھ جائے گی۔'' سمری نے ٹوکا تو دشرتھ چونک اٹھا۔ پھر بولا۔

''ہاں سمری، روٹی سوکھ جائے گی پر ہم تو تیرے ہی لئے سوچ رہے تھے۔ اگر

تیرا کوئی بیٹا ہوتا تو تجھے یہ سب نہ جھیلنا پڑتا۔

اس رات کے بعد ایک اور صبح آئی دشرتھ اپنے کام پر چلا گیا۔ سمری اپنے کام میں لگ گئی۔ اس نے جھاڑو لگائی، آنگن لیپا، اپلے تھاپے، لکڑیاں توڑ کر جلائی چولہا جلایا اور آٹا گوندھنے لگی۔ رات کو سمری نے اپنی پڑوسن سے تھوڑا سا دہی کا جورن مانگا تھا۔ اور پہلی بار اپنی اکلوتی بکری سونی کا تھوڑا سا دودھ دوہا تھا اور اس سے اپنے بڑھو کے لئے دہی جما دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ سونی کا دودھ اس لئے نہیں دوہتی تھی کہ کہیں اس کا میمنا بھوکا نہ رہ جائے۔ لیکن پچھلے دو تین دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ میمنا اب گھاس پر تھوڑا تھوڑا منھ مارنے لگا ہے۔ تب اسے اطمینان ہو گیا تھا۔ اور اس نے سونی کا دودھ دوہ لیا تھا۔ اور یہ سوچ کر خوش تھی کہ اب تھوڑے دنوں کے لئے اس کے بڑھو کو پیاز روٹی سے نجات مل جائے گی۔ اور پھر جب وہ روٹی اور دہی کا مٹھا لے کر کھیت جانے والے راستے پر پہونچی تو اس نے دیکھا۔ دشرتھ اس ننھی سی چھینی اور ہاتھ بھر کی ہتھوڑی سے پہاڑ کے پتھر کاٹنے میں جٹا ہوا ہے۔

سمری نے بہت منع کیا مگر دشرتھ نہ مانا۔ وہ ہر روز کھیت کا کام ختم کر لینے کے بعد پہاڑ کاٹنے میں جٹ جاتا۔ اس کا یہ جنون دیکھ کر کچھ لوگوں نے اس کا مذاق بنایا۔ کچھ نے ہمدردی ظاہر کی۔ کچھ نے منع کیا اور کچھ نے اس کا ساتھ دینے میں اپنی خدمات پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دشرتھ نے نہ کسی کے مذاق کا برا مانا نہ کسی کا احسان لیا ور چپ چاپ اپنے کام میں لگا رہا۔

اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ اور پھر ایک دن سمری کھیت پر نہیں آئی۔ دشرتھ سارا دن بھوکا بیٹھا پہاڑ کے پتھر کاٹتا رہا۔ پھر شام ڈھلے جب دشرتھ اپنے گھر پہونچا تو سمری اپنی کھاٹ پر بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ وہ دشرتھ کی آہٹ سن کر بھی نہیں اٹھی۔

"بہت تھک گئی ہے بے چاری، اسے ابھی آرام کرنے دو"۔ دشرتھ نے سوچا اور اپنی چال اور دھیمی کر دی۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا وہ چولھے کے پاس گیا تو چولھا بجھا ہوا

تھا۔اور پاس میں رکھی روٹی کی ڈلیہ خالی پڑی تھی۔ اور سونی بنا پگہے کے آنگن کے ایک کونے میں بیٹھی ممیا رہی تھی۔اور ننھا میمنا کھلے آنگن میں دھر ادھر گھوم رہا تھا۔ چیزوں کو سونگھتا کچھ ڈھونڈتا ہوا سا۔

دشرتھ نے میمنے کو اس ڈر سے پہلے اٹھا لیا کہ کہیں وہ سمری کی کھاٹ پر چھلانگ مار کرے جگا نہ دے۔ پھر میمنے کو اس نے ٹوکرے سے ڈھک دیا۔ ڈھکتے وقت میمنے نے حتجاجی ممیاہٹ بکھیری تھی پھر خاموش ہو گیا تھا۔

پھر اس نے سونی کے گلے میں پگہا ڈال کر اسے کھونٹے سے باندھ دیا۔سونی کو باندھ چکنے کے بعد وہ کوٹھری میں گیا کوٹھری کے طاق پر گڑ کی ایک چھوٹی سی ڈلی رکھی ہوئی تھی۔دشرتھ نے سوچا آج اسی سے کام چلا لیا جائے۔یہ سوچ کر اس نے گڑ کی ڈلی اٹھائی اور اسے منہ میں ڈال لیا پھر آنگن کے چبوترے پر رکھے گھڑے میں سے ایک لوٹا پانی نکالا اور غٹاغٹ پی لیا۔ پانی پینے کے بعد اسے خیال آیا کہ سمری کو چادر اوڑھا دینا چاہئے۔ اسے ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔تب اس نے کوٹھری کے کونے میں پڑا لوہے کا ایک پرانا ٹرنک کھولا اور اس کے اندر سے چار خانے کی دھلی ہوئی چادر جس کا رنگ جگہ جگہ سے ہلکا ہو چکا تھا ڈھونڈ کر نکال لی اور اسے لے کر سمری کی کھاٹ کے پاس پہونچ کر اس نے ذرا دیر اس کے چہرے کو دیکھا۔وہ اسی طرح بے خبر پڑی تھی۔اور اس کا چہرہ پیلا پیلا سا معلوم ہو رہا تھا۔دشرتھ نے دھیرے سے اس کے بدن پر چادر ڈال دینی چاہی لیکن چادر ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ سمری کے بدن سے چھو گیا۔اور تب اسے لگا کہ سمری کا بدن تو ایک دم ٹھنڈا ہے۔

''بہت تھک گئی ہے بے چاری'' دشرتھ اس کے بارے میں سوچ کر دکھی ہو گیا۔لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سمری کو ہمیشہ کی تھکن سے چھٹکارا مل گیا ہے۔

صبح سویرے اس کے دروازے پر بھیڑ جمع ہوگئی تھی لوگوں نے بہت سمجھایا لیکن

دشرتھ یہی کہتا رہا کہ۔

"سمری بہت تھک گئی ہے اور ابھی آرام کر رہی ہے"۔ اسے کوئی تنگ نہ کرے۔ اور یہ کہہ کر وہ پھر اپنے کام پر چلا گیا۔

اور پھر ایک دن اس نے پہاڑ کے سارے پتھر اکھاڑ پھینکے۔ تب ایک راستہ نکل آیا سولہ فٹ چوڑا اور بیالیس میل لمبا راستہ۔ دشرتھ کو اس کام میں پورے پندرہ برس لگے تھے۔

اب اس راستے پر لوگوں کا آنا جانا آسان ہو گیا ہے۔ گاؤں سے شہر کی دوری بیالیس میل کم ہو گئی ہے۔ اور راجیہ سرکار نے دشرتھ کے اس کارنامے پر اسے پانچ سو روپے کے انعام سے نوازا ہے۔

لیکن دشرتھ اپنے بنائے اس راستے پر کھڑا آج بھی اپنی سمری کا انتظار کر رہا ہے۔

سمری روٹی کی پوٹلی اور پانی کی مٹکی لے کر آتی ہی ہوگی اور اب اس راستے پر چلتے ہوئے اس کو چوٹ نہیں لگے گی۔ اور اس کے گھٹنے نہیں چھلیں گے۔

☆☆☆☆☆

سیاپا

پوس کی ٹھنڈی، اندھیری رات کے سناٹے میں سُربھی کے دروازے پر دستک ہوئی تو سُربھی چونک کر جاگ اٹھی۔ لیکن وہ بستر سے اٹھی نہیں۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کا وہم ہے۔ بھلا کون آئے گا اس وقت؟ ماں تو پورے تین دن کے سیاپے پر پاس والے گاؤں گئی ہوئی ہے، کیوں کہ اس گاؤں کے بڑے ٹھاکر صاحب چل بسے ہیں۔ اور جب کبھی موت کی دستک کسی بڑے آدمی کے دروازے پر ہوتی ہے تو اسے اپنے گھر میں اکیلے رہنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کے بعد کئی دن کے لئے روٹی کی طرف سے بے فکری ہو جاتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی ماں کئی دن بعد جب سوجی آنکھیں اور تھکا ہوا چہرا لے کر گھر لوٹتی تھی تو اسے بڑا دکھ ہوتا تھا۔

بچپن سے ہی سُربھی کو ان کرائے کے ماتم کے پیشے سے نفرت سی تھی۔ مرے کوئی اور رونا پڑے عزیزوں، رشتہ داروں کی جگہ کسی اور کو۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہوئی؟ لیکن یہ بڑے لوگوں کی شان کا سوال تھا۔ ان کی شان، ان کی عظمت اسی میں تھی کہ ان کی ودھوا زیادہ سے زیادہ دیر تک ان کے ماتم کا اہتمام کرے، تاکہ لوگوں کو برسوں یاد رہے کہ کسی ٹھاکر یا زمین دار کی موت پر کتنے دن تک اور کیسا سوگ منایا گیا۔ ان کی اولاد انہیں کتنا چاہتی تھی اور اپنی رعایا میں وہ کتنے مقبول تھے، اسے آنکنے کا یہی پیمانہ تھا۔

اب دھیرے دھیرے زمین داری ختم ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ زمین داروں کی شان و شوکت بھی۔ بیتے دور کی یادگار کے طور پر آس پاس کے دیہات میں کچھ

لوگ ہی بچے ہوئے تھے جن کی اولاد ان کی موت پر سیاپا کر سکتی تھی۔

سُربھی کے گاؤں میں اب گنی چنی بوڑھی سیاپا کرنے والیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ان کے بیٹے، بھائی سب کام کی تلاش میں شہروں میں جا بسے تھے۔ یہی چند عورتیں اب اس گاؤں کی میراث تھیں، جو کبھی کبھی آس پاس کے دیہات میں گزرے ہوئے کل کے زمین داروں اور ٹھ کردں کے خاندانوں کے کسی آدمی کی موت پر سیاپے کے لئے بلائی جاتی تھیں۔

سُربھی نے بچپن سے ہی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننے کے سپنے سجا رکھے تھے۔ اور اس کی جاگتی آنکھوں کے ان خوب صورت سپنوں کو حقیقت میں بدلنے کی دھن میں اس کی ماں نے بڑے دکھ جھیلے تھے۔ وہ دن رات کام کرتی تھی۔ کبھی کھیتوں میں، کبھی گھروں میں، اور جب کبھی کہیں سے سیاپے کا بلاوا آجاتا تو وہاں بھی چلی جاتی تھی، پھر بھی وہ اس لئے انکار نہیں کرتی تھی کہ کئی دن کی روٹی کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اور فی الحال سب سے بڑی ضرورت وہی تھی۔

اس گاؤں میں شام ڈھلے ہی سناٹا گھر آتا تھا۔ خاص طور سے جاڑوں کی رات میں۔ مغرب کی اذان کے فوراً بعد لوگ کھا پی کر سو جاتے تھے۔ کیونکہ منھ اندھیرے ہی اٹھ کر انہیں اپنے کام پر دور دور تک جانا پڑتا تھا۔ اس وقت جب سُربھی کے دروازے پر دستک ہوئی تھی تو رات کے صرف نو ہی بجے تھے۔ اور دن بھر کے تھکے ماندے لوگ ابھی سے کل کی امید پر خوابوں کی دنیا میں کھو گئے تھے۔ سُربھی لیٹے لیٹے ہی حالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہونے لگی۔ سربھی نے بے دلی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

اس کے سامنے چار آدمی کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں پیلی پیلی، بیمار سی روشنی والی لالٹینیں لئے۔ تھکے تھکے اور نڈھال سے۔ ایک ہاتھ میں لالٹین، دوسرے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے سنبھالے، بھیڑوں کے اون سے بنے ہوئے کھردرے کمبل

اوڑھے۔

ٹانگیں آدھی آدھی کھلی اور مٹی سے کتھڑی ہوئی۔

"جانے کس گاؤں اور کس کام سے اتنی رات کو پیدل چل کر آرہے ہیں یہ لوگ؟" سُر بھی نے سوچا۔

اگلے ہی پل آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"ای گھر سینیچری کا ہے نا بیٹا؟"

"جی ہاں، یہ گھر ان ہی کا ہے۔ اور میں ان کی بیٹی ہوں۔ میرا نام سُر بھی ہے۔ لیکن اس وقت ماں گھر میں نہیں ہیں۔ وہ پاس کے گاؤں میں کسی کے سیاپے پر گئی ہوئی ہیں۔ دو دن بعد لوٹیں گی۔" سُر بھی نے بڑی روانی سے یہ سب کہا۔

اس کی بات سن کر وہ سب اٹھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"چھوٹے مالک کی عزت کا سوال ہے"۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ان میں سے سب سے بوڑھا آدمی سُر بھی سے کہنے لگا۔

"تو بیٹی تو ہی ہمارے ساتھ چل چل۔ ہم بڑی دور سے آئے ہیں"۔

"کیوں اور کس لئے؟" سُر بھی نے پوچھا۔ وہ بولا۔

"بڑے ٹھاکر سورگ سدھار گئے ہیں اور چھوٹے ٹھاکر نے پورے سات دن کا سیاپا رکھا ہے۔ کوئی مول بھاؤ نہیں۔ مونہہ مانگا انعام ملے گا۔"

"لیکن مجھے تو یہ کلا آتی ہی نہیں ہے، بابا۔ آپ کسی اور کو لے جائیں"۔

"ہر جگہ دیکھ آئے ہیں، بیٹی۔ سب کے گھر خالی پڑے ہیں۔"

"نہیں رو سکتی میں۔ اپنے لئے بھی نہیں۔"

سُر بھی نے سوچا۔ "میرے آنسو تو کب کے سوکھ چکے ہیں۔"

"تیری ماں کی تو دور دور تک شہرت ہے۔ اس کی جگہ تو ہی لے سکتی ہے، بیٹی۔"

بوڑھے نے کہا۔

''میں آپ کو بتا چکی ہوں نہ بابا۔ مجھے یہ کلا نہیں آتی۔ میں مجبور ہوں۔'' میرے سپنے تو کچھ اور ہی تھے، جو ٹوٹ گئے۔'' سربھی نے جیسے اپنے آپ سے کہا ہو۔

''تو نے یہ کلا سیکھی ہو یا نہیں، یہ تو تیرے خون میں رچی ہوئی ہے، بیٹی۔ بس تو ہماری لاج رکھ لے۔ ہم اگر خالی ہاتھ لوٹے تو .... دیکھ بیٹی، ہم ٹھاکروں کے حکم کے غلام ہیں۔ تو سیاپا کر سکے گی یا نہیں، یہ چل کر خود چھوٹے ٹھاکر سے کہہ دینا۔''

سُربھی نے دور آسمان کی طرف دیکھا، جس پر سیاہی کے گہرے سائے تھے۔ پھر اس نے ان تھکے ہوئے بوڑھے چہروں کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اندر چلی گئی۔ اس نے ماں کا بکس کھولا اور اس کے اندر سے ایک کوری کالی چادر نکال لی۔

یہ وہی چادر تھی جو اس کی ماں نے اس کے لئے بہت پہلے خریدی تھی اور جسے اوڑھنے سے سُربھی نے انکار کر دیا تھا۔ وہ چادر اب تک کوری ہی پڑی تھی، جب کہ سُربھی کے گورے بدن پر ایک رنگ ریز داغ لگ گیا تھا۔ اپنے رنگ کے کالے چھینٹے اس معصوم اجلی کلی پر ڈال کر وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

وہ دن سربھی کے لئے امنگوں کے دن تھے، آسمان پر اڑنے کے دن تھے۔ کالج کی پڑھائی میں اول، کھیل کود میں اول، کلچرل پروگراموں میں اول۔ اور ایسے ہی لمحوں میں یک دن اسی کالج میں پڑھنے والے ایک بھیلئے نے ایسا جال پھینکا کہ وہ پھنس ہی تو گئی۔ اور جب اسے ہوش آیا تو وہ کہیں نہیں تھا۔ سُربھی نے اسے بہت ڈھونڈا۔ گرم ریت پر چلتے چلتے اس کے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔ اور پھر ایک دن اس پر بد چلنی کا الزام لگ گیا اور اسے کالج کے ہوسٹل سے نکال دیا گیا۔

یوں اسے لوٹ آنا پڑا اپنی اسی چوکھٹ پر جہاں سے وہ اپنی ماں کو بھی نکال لے جانا چاہتی تھی۔ جس جہنم سے وہ اپنی ماں کو بھی چھٹکارا دلانے کا ارادہ رکھتی تھی، اسے خود بھی

وہیں پناہ لینی پڑی۔

چادر کو ہاتھ میں لئے لئے ہی سُر بھی نہ جانے کیا کیا سوچنے لگی تھی کہ اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے پکار پکار کر کہہ رہا ہو۔ ''آج تو یہ چادر اوڑھ ہی لے، سُر بھی۔ کل نہ جانے کیا ہو۔ کون جانے آج سے پہلے کی طرح آج کے بعد بھی پھر کبھی تجھے اس چادر کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس بوڑھے بابا کے تھکے پیروں کا خیال کر، سُر بھی۔'' اور اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی سر بھی کے ہاتھ چادر سمیت اس کے سر تک جا پہنچے۔ یہ دیکھتے ہی بوڑھے بابا کی آنکھوں میں روشنی جاگ اٹھی۔

جب وہ سب بڑے ٹھاکر کے گاؤں پہنچے تو رات آدھی ادھر، آدھی ادھر ہو چکی تھی۔ پورے راستے لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی اور سیاروں کی ''ہوں .... آں ہوں آں'' اور جھینگروں کی جھن جھن ان کے ساتھ ساتھ چلی تھی۔

حویلی کے نزدیک پہنچتے ہی سُر بھی کو ایسا لگا جیسے چاروں طرف کے گھپ اندھیرے کو دھکیل کر سورج ٹھیک اس کے سامنے اتر آیا ہو۔

اپنی کالی چادر کے نیچے سے سر بھی نے اپنے سامنے ایک چہرہ دیکھا اور اچانک بوڑھے بابا کی احسان مند بن گئی۔ وہ اور کچھ تو دیکھ ہی نہ سکی۔

اگر آج بوڑھے بابا نے ضد کر کے اسے کالی چادر نہ اڑھادی ہوتی تو وہ زندگی بھر اپنے آنسوؤں کے سوتے کو ڈھونڈتی رہ جاتی۔ وہ دوڑ کر بابا کے قدموں میں جھک گئی اور بولی ''مجھے آشیرواد دیجئے بابا کہ میں اپنے اس امتحان میں کام یاب ہو جاؤں۔''

بابا نے کچھ سمجھے بغیر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ چھوٹے ٹھاکر کے چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔ سامنے الاؤ جل رہا تھا۔ لکڑیاں چٹک رہی تھیں اور چنگاریاں اوپر ہوا میں اُڑ کر فضا میں گم ہوتی جا رہی تھیں۔

یکایک اپنی کالی چادر اوڑھے، بھیڑ کو چیرتی ہوئی سُر بھی ٹھاکر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ لوگ گھبرا کر تھوڑا سا دور دور کھسک گئے۔ اسی دم نہیں اس سیاپا کرنے والی

کی آواز سنائی دی۔

"مجھے پہچانتے ہو ٹھاکر؟" یہ کہتے وقت سُر بھی نے اپنے چہرے کی چادر تھوڑی سی کھسکا دی تھی۔

چھوٹے ٹھاکر نے نظریں اٹھا کر دیکھے بغیر ہی کہا۔ "سیاپا کرنے والیوں کو پہچاننے، نہ پہچاننے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ان کی پہچان تو بس یہ کالی چادریں ہوا کرتی ہے، چہرہ نہیں۔ دیکھو لڑکی، مجھے بابا نے بتا دیا ہے کہ تم آنا نہیں چاہتی تھیں، لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی، کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ بس یہ خیال رہے کہ ہماری عزت مٹی میں نہ ملے۔ ہمارے بابا کے سات دن کے ماتم میں ذرا بھی کمی نہ رہ جائے۔ اس کے بدلے تم مجھ سے جو چاہو مانگ لینا۔"

اتنا کہہ کر چھوٹے ٹھاکر اپنے کمرے میں چلے گئے اور بھیڑ بھی ہٹ گئی۔

بڑے ٹھاکر صاحب کی لاش صحن کے بیچوں بیچ رکھی تھی۔ ان کے سرہانے اگربتی اور لوبان جل رہا تھا۔ گھر کی عورتیں سفید کپڑے پہنے لاش کے چاروں طرف سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔

آنگن میں شامیانہ لگا تھا اور اس کے نیچے ایک سیاپا کرنے والی بالکل کوری کالی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس کے آس پاس اس کا ساتھ دینے کو محلے کی کچھ غریب بیوائیں بھی آئی تھیں۔ سیاپا شروع کرنے کا وقت صبح چار بجے سے رکھا گیا تھا۔

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہی تھی کہ لوگوں کا آنا شروع ہو گیا۔ ساری حویلی بھر گئی۔ اور پھر سیاپا شروع ہو گیا۔

سیاپا کرنے والی کی آواز میں ایسا درد، ایسا کرب تھا کہ کبھی نہ رونے والوں کی آنکھیں بھی رو پڑیں۔ بہت دیر تک یہ دل دوز سیاپا جاری رہا۔ اتنے میں بڑے ٹھاکر کی آخری رسوم کا وقت بھی آ پہنچا۔ چتا کو آگ دینے کے لئے چھوٹے ٹھاکر کو ڈھونڈا جانے لگا۔ لیکن وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ ان کے کمرے کی چٹخنی باہر سے چڑھی ہوئی تھی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ چھوٹے ٹھاکر کمرے میں نہیں ہوں گے، کیوں کہ اگر ہوتے تو دروازہ باہر سے بند نہ ہوگا، ایک آدمی نے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ اور پھر بے اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔

ڈرے سہمے لوگوں نے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی اور پھر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ رات کے کسی پہر ایک سیاپا کرنے والی اس کمرے میں گئی تھی اور اس نے ان سے کچھ سوال کئے تھے، جن کا جواب چھوٹے ٹھاکر نہیں دے سکتے تھے۔

اور پھر سیاپا کرنے والی نے آپ کو تیار کر لیا۔ ایک ایسے ماتم کے لئے جیسا شاید کبھی نہ ہوا ہوگا۔

اب برسوں بعد بھی جب کہیں ماتم کی بات ہوتی ہے تو لوگ پوس کی اس ٹھنڈی رات کے سناٹے والے ماتم کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس رات کے بعد وہ ماتم کرنے والی بھی نہیں بچی تھی۔ سر اور کلیجہ پیٹ پیٹ کر ماتم کرنے کی وجہ سے اس کے کلیجے کو زبردست چوٹ پہنچی تھی۔ اور وہ پھٹ گیا تھا۔

اور جب وہ مر گئی تھی اور لوگوں نے اس کا مردہ چہرہ دیکھا تھا تو سب کو ایسا ہی لگا تھا کہ پوہ کی اس رات میں سر بھی نے کسی اور کا نہیں، بلکہ خود اپنا ماتم کیا تھا!

☆☆☆☆☆☆☆

ٹوٹے شیشے کا درپن

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کھڑکی کے اوپری حصے کا شیشہ۔ جو چٹخا ہوا تھا۔ کواڑوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے ٹوٹ کر جھنک سے زمین پر گر گیا۔ سارے کمرے میں کانچ کے ننھے ننھے ٹکڑے بکھر گئے۔

سوموہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔

''اس منحوس بجلی نے تو تباہ کر ڈالا ہے۔ کہنے کو کویلہ اور بجلی مفت ملتے ہیں لیکن یہ ملنا بھی کوئی ملنا ہوا؟ گھنٹوں گھنٹوں بجلی غائب اور کوئلہ ختم ہو جانے پر ہفتوں اس کے لئے دوڑنا۔ پہلے تو پھر بھی غنیمت تھا۔ تیسرے چوتھے مہینے کوئلہ خود ہی گرا جاتے تھے دروازے پر۔''

جلدی جلدی ڈیوٹی کے کپڑے پہنتا ہوا سوموا اپنے آپ ہی بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اندھیرے میں چیزوں کا اٹھانا رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اور بذریعہ سائیکل ابھی پورے پندرہ منٹ کا راستہ طے کرنا ہے۔ ڈیوٹی بارہ بجے رات سے شروع ہوتی ہے اور پہلے ہی بارہ بج چکے ہیں۔ آج چنی بھی گھر میں نہیں ہے۔ اس پڑوسی راجو کے کارن اس بیچاری کو مائیکہ بھیجنا پڑا۔ دن رات کبھی پانی کو لے کر جھگڑ کرتا ہے، کبھی نالی کے بہانے۔

اور اس کے بچوں نے جو میری کھڑکی کا شیشہ پتھر مار کر توڑ ڈالا۔ میری بیوی کے

لگائے امرود کے پیڑ کے سادے کچے پکے پھل بکریوں کی طرح چبا گئے۔ بیروں کی ایک گچھی بھی ڈال پر نہ چھوڑی۔

ورنہ یہ کمبخت کرتا را؟ وہ بھی اس راجو کے بہکاوے میں آ گیا اور آج تو اس کا اصلی رنگ سامنے آ گیا ہے۔ اب سے پہلے ہمیشہ ساتھ ڈیوٹی جاتا تھا آج آواز بھی نہ دی۔ خودغرض کہیں کا۔ تھالی کا بیگن۔

آج میری آنکھ لگ گئی۔ شیشہ نہ گرا ہوتا تو شاید نیند بھی نہ کھلتی اور چلے جاتے میرے سو روپے ان کا کہنا ہے چمچہ گیری کرکے حاضری تو لگوا لیں گے۔ مارا تو جاؤں گا میں۔ اپنی محنت کی کھاتا ہوں۔ پورے آٹھ گھنٹے کھٹتا ہوں۔ رات کی پالی میں بغل میں گدا اور تکیہ لئے نہیں پھرتا۔ کہ جہاں موقع ملے لڑھک جاؤں۔ ڈیوٹی کرنے کی بجائے خراٹے بھروں۔"

بڑبڑاتے بڑبڑاتے سومو سائیکل دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ بات یہ تھی کہ سومو، کرتا رسنگھ اور راجو تینوں ایک ساتھ کوئلے کی ایک ہی کان میں ڈیوٹی کرتے تھے۔ ان تینوں کے کوارٹر بھی ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ایک بلاک میں دو کوارٹر ہوتے تھے۔ اور دو گھروں کے لئے چھت پر پانی کی ایک ہی ٹنکی ہوتی تھی اور نالی بھی ایک ہی ہوتی تھی جو گھروں سے باہر جا کر ایک بڑے نالے میں گرتی تھی۔

پڑوسیوں میں پانی اور نالی کو لے کر اکثر جھگڑے ہوا کرتے ہیں۔ پھر وہ ایک دوسرے سے مل بھی جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی معاملات کئی بار ان کے ساتھ بھی ہوئے تھے۔ لیکن وہ پھر بھی ساتھ ساتھ ڈیوٹی جاتے تھے۔ خاص کر رات کی پالی میں۔ اس لئے کہ گھر سے ڈیوٹی تک پہنچنے کا راستہ سنسان تھا۔ ور ایک ساتھ جانے کی صورت میں تینوں ایک دوسرے کے رکھوالے ہوتے تھے۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے آس پاس کے ماحول پر تناؤ کی چادر تنی ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے بدگمان ہونے لگے تھے۔ اور سی کا اثر ان لوگوں پر بھی پڑا تھا۔

تھے پرشکنیں لئے سوموہانپتا کانپتا ڈیوٹی والی جگہ پر پہونچا تو معلوم ہوا راجو اور کرتارا کان کے اندر اتر چکے ہیں۔

سوموآج پورے آدھے گھنٹے لیٹ تھا۔ حاضری بابو نے دو چار باتیں سنانے کے بعد اس کی حاضری تو لگادی۔ لیکن الگ سے حاضری لگانے کی وجہ سے جانے کے بہانے اس سے پانچ روپے بھی اینٹھے تھے۔

کمر پر بیٹری باندھ کر اور سر پر ہیڈ لیمپ اور ہیلمٹ کو اوڑھ کر وہ کان میں اترنے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ کوئلہ کان کم سے کم سو میٹر گہری تھی۔ ساری سیڑھیاں سنسان پڑی تھیں۔

سوموجب آخری سیڑھی پر پہونچا تو دو ہیڈ لیمپوں کی جلتی بجھتی روشنی اسے جھلملاتے ہوئے جگنوؤں جیسی معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ جن سروں پر یہ روشنیاں لگی ہوئی تھیں وہ شاید چل رہے تھے۔ کیونکہ ان سروں کے نیچے جو کندھے تھے اور کندھوں سے جڑے ہوئے جو ہاتھ تھے۔ وہ کوئلے کی دیواروں میں سوراخ بنا رہے تھے۔ سوموکوئلے کی ایک چٹان کی طرف چل پڑا جہاں بڑی بڑی موٹی موٹی بیلٹوں کو ٹھیک کھڑی کرکے کوئلے کی ایک چال کو گرنے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کوئلے کی یہ چھت دوہری تھی۔ اور اس نچلی چھت سے اس کے اوپر والی چھت میں کوئی دس بارہ انچ کا فاصلہ تھا۔ یعنی کہ یہ ایک درار کی مانند تھا۔

سومو نے سوراخ بنانے والا آلہ لیا اور اس سے کوئلہ کی ایک چٹان میں سوراخ بنانے لگا۔ اس کے بعد اس میں بارود کی گلیاں بھرنی ہوتی تھیں۔ تب دور جا کر اسے بلاسٹ کرنا ہوتا تھا۔ تب کوئلے ٹوٹ کر گرتے تھے۔ اور انہیں بیلٹوں کے ذریعے باہر لایا جاتا تھا۔

سومواپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ کہ اچانک اسے ایک آواز سنائی دی۔ اور اسے لگا کہ اس کی دائیں پنڈلی میں پتھر اسما گیا ہے۔ اس کے پیر لڑکھڑا گئے۔ اور اس کے حس

پاس کوئی نہیں تھا اور اس نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ کان کے اندر پانی بھر گیا تھا۔

''کرتار سنگھ ......'' وہ اتنی زور سے چلایا کہ اس کا حلق چھل گیا۔ لیکن کرتار سنگھ اس سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس لئے اس کے کانوں کو سومو کی آواز کا ہلکا سا لمس محسوس تو ہوا لیکن وہ اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔

''بھاگو! سومو پھر زور سے چلایا۔ کان میں پانی بھر رہا ہے۔'' کو کرتار سنگھ کے بندھے کانوں نے اس بار خطرے کا ہلکا سا اشارہ سمجھ اور اس نے راجو کو آواز لگائی۔ اور تب وہ دونوں مل کر اور دوسرے لوگوں کو خبر کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے گئے۔ سومو کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ اور وہ ان سوراخوں کو بند کرنے میں جٹا ہوا تھا۔ جن سے پانی نکل رہا تھا۔ لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ پانی اب فوارے کی مانند ابنے لگا تھا۔ کوئلے کی چٹانیں ہلنے لگی تھیں۔ اگر یہ چٹانیں گر جائیں تو سومو اور ان چوہتر پچھتر کان مزدوروں کو ایک لمحہ بھی نہ مل پاتا۔

پل کی پل میں ساری کان پانی سے بھر گئی۔ بچاؤ کا کام تیزی سے جاری تھا۔ پھر بھی سارے لوگوں کو نکالا نہ جا سکا۔ کیونکہ کان کے منھ تک پانی بھر چکا تھا۔ اور سات لوگ کوئے کی درار میں پھنسے ہوئے تھے وہ نہ اوپر یعنی باہر آ سکتے تھے۔ نہ نیچے اتر سکتے تھے۔ کیونکہ نیچے اتھاہ پانی تھا۔ اور اوپر کوئلے کی ڈیڑھ سو میٹر موٹی چھت پانی نکالنے کی تمام کوششیں بیکار ہو گئی تھیں۔ جتنا پانی نکالا جاتا منٹوں میں اس سے دوگنا پانی بھر جاتا تھا۔

اچانک سومو کے ذہن میں ایک بات آئی۔ یہ ترکیب اپنے آپ میں انوکھی اور غیر یقینی تھی۔ پھر بھی آزمانے کی رضامندی مل گئی۔ اور تب زمین پر دو انچ گولائی کا سوراخ بنایا جانے لگا۔ یہ سوراخ نیچے زمین کے اندر ڈیڑھ سو میٹر تک گہرا بنایا جاتا تھا۔

آخر سوراخ بن کر تیار ہو گیا۔ اور پھر اس کے اندر، تنا ہی لمبا تار لگایا گیا۔ اور اس کے آخری سرے پر ٹرانسمیٹر جیسی ڈبیا۔ جو اندر کی آواز کو اوپر تک لا سکے۔

یہ ماچس کی ڈبیوں میں دھاگہ باندھ کر ایک دوسرے تک آواز پہونچانے

والے کھیل جیسا تھا۔ لیکن اس کھیل پر سات آدمیوں کی زندگی کا انحصار تھا۔ جیسے ہی یہ خبر ملی کہ وہ ساتوں لوگ زندہ ہیں باہر والوں کا جوش دوگنا ہوگیا۔ جبکہ بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں یہی سوال جھانک رہا تھا کہ ''یہ لوگ زندہ بھی ہیں تو نکالے کیسے جائیں گے؟''

''ہم کوشش کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ جس طرح کنویں میں ڈوبے ہوئے کو نکالا جاتا ہے۔'' سومو نے کہا۔ ''کنویں کی حد ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے اندر بالٹی ڈالی جاتی ہے اس کا منھ کھلا ہوتا ہے۔''

''اس چھوٹے سوراخ کو چوڑا نہیں کیا جا سکتا؟''

سومو کی آواز سن کر سب چونک اٹھے۔ منجیت کے دماغ میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ اور پھر یہ کہ اندر چاروں طرف کوئلے کی چٹانیں ہیں نکالنے کے سلسلے میں کسی بھی چٹان سے ٹکرا کر ان کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔

''اس کے لئے ایک سات فٹ اونچا اور چوبیس پچیس انچ گولائی والا کمرہ ہوگا۔ ہم اس سوراخ سے اسے لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر اندر اتاریں اور پھر ایک ایک کر کے انہیں نکال لیں۔''

ایک دن اور ایک رات میں سارے انتظامات مکمل کر لئے گئے۔ اور دوسری صبح دھڑکتے دلوں کے ساتھ کام شروع ہوگیا۔ دور دور تک دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی تھی۔

اور اندر چودہ آنکھیں ایک دوسرے کی طرف بے بسی کے عالم میں دیکھ رہی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں کہ اب موت یقینی ہے۔

دور جب یہ کیپسول نما اتارا گیا تو اسے دیکھ کر لوگ اور بھی ڈر گئے۔ تب انہیں آواز سنائی دی۔

''آپ لوگ ایک ایک کر کے اس کیپسول کے اندر چلے جائیں۔ ڈریں نہیں یہ آپ کے بھلے کے لئے ہے۔ آپ لوگوں کو بچانے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

اندر پھر بھی خاموشی تھی۔ تب راجو نے کہا۔

''اس کیپسول میں بند ہو کر ہم میں سے کسی کو اندر جانا ہوگا۔ تب شاید کچھ بات بن سکے''۔ سب نے یہ بات سنی لیکن آگے بڑھنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

لیکن جب سوموا اندر جانے لگا تو کرتار سنگھ نے اسے روک لیا۔

''اب ہم کو بھی کچھ کرنے کا موقع دو یار! ویسے بھی تم دونوں کے مقابلے میں تگڑا ہوں''۔

''لیکن ہم تمہیں کھینچ نہیں سکیں گے۔ اس لئے مجھے جانے دو۔'' راجو نے کہا۔

''دیکھو بھائی۔ دیر کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اب میں جا رہا ہوں'' سوموا یہ کہتے کہتے کیپسول کے اندر گھس گیا۔

راجو، کرتار اور دوسرے لوگوں نے بھی منع کیا کیونکہ اندر خطرہ تھا۔ پہلے ہی سات لوگوں کی جانیں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ اب آٹھویں کو بھی۔ سب کے ماتھے پر پسینے چمک اٹھے۔

کیپسول نیچے گہرائی میں اُترتا چلا گیا۔ اور کئی جھٹکے کھانے کے بعد ایک چٹان سے ٹکرا کر پھرکی کی طرح گھوما اور پھر رک گیا۔ پھر اس کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے ہوائی جہاز کی سیڑھی جیسی ایک سیڑھی نکل کر کوئلے کی اس درار پر رُک گئی۔ سوموا جب سیڑھی پر چلتا ہوا اس درار تک پہونچا تو چودہ آنکھیں زندگی کی امید سے مایوس ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ لیکن ان میں ابھی جان باقی تھی۔

''تم لوگ زندہ ہو میرے دوستو! آنکھیں کھولو اور ہمت کرو۔ صبح کے سورج کی کرنیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

اوپر کھڑے لوگوں کی سانسیں جیسے رُکی جا رہی تھیں۔ اور تمام آنکھیں اب سوراخ کی طرف متوجہ تھیں۔ اور مایوسی اپنے عروج کو پہنچنے ہی والی تھی۔ کہ انہیں وہ کبھی بھی آواز سنائی دے گئی جو کیپسول کو اوپر کھینچنے کا اشارہ تھی۔ اب لوگوں کے دلوں کی دھڑکن

اپنے اپنے کانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔

ور جب کیپسول سوراخ کے منھ تک آ پہنچی تو سب کے منھ سے ایک آواز نکل آئی۔

''سومو ....'' لیکن وہ سومو نہیں تھا وہ ان ساتوں میں سے ایک تھا۔ جس کے اندر نہ بونے کی سکت تھی نہ ہنسنے کی۔

کیپسول دوبارہ اندر ڈال دیا گیا۔ اور اسی طرح ایک ایک کر کے ساتوں لوگ نکال لئے گئے۔ سب سے آخر میں سومو باہر نکلا۔ اور سب لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔

کان مزدوروں کی دنیا میں ایسا واقعہ اس سے پہلے نہیں گزرا تھا یہ ایک مثالی واقعہ تھا، آپسی میل محبت اور انسانی دماغ کا۔

تمام مزدوروں کو ہسپتال لے جایا گیا۔ کچھ دن علاج کے بعد وہ سب ٹھیک ہو گئے۔

پھر ایک جشن منایا گیا۔ جلوس نکالے گئے۔ لیکن جلوس میں سومو سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔

''اس رات اگر وہ شیشہ نہ گرتا تو میری نیند نہ کھلتی اور میں ڈیوٹی نہیں جا پاتا۔ وہ ٹوٹا شیشہ ہی کام آ گیا۔ سومو اپنے آپ ہنس پڑا۔ اب کھڑکی میں نئے شیشے لگوانے ہوں گے۔ راجو اور کرتار کے بچوں کے توڑنے کے لئے! بیری کی شاخوں پر پھول جو آنے لگے تھے۔

گڑیا

وہ اپنی بیوہ ماں کی اکیلی لڑکی تھی اور ذات کی بنجارن۔ اس کا بابا ایک دن پہاڑی چراگاہ سے اپنی بھیڑیں چرا کر نیچے اتر رہا تھا تو ایک چھوٹے چٹانی پتھر پر اس کا پیر پڑا، اور وہ پھسل کر نیچے لڑھکنے لگا تو اس نے بھی اپنا توازن کھو دیا اور پتھر کے ساتھ پھسل کر نیچے گر گیا تھا۔ اس وقت اس بچی کی عمر صرف چھ مہینے کی تھی۔ اڑوس پڑوس اور جان پہچان والوں کے بہت زور دینے پر بھی اس کی ماں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس وقت اس کے پاس کل چالس بھیڑیں تھیں۔ اور دو بیگھے دھان کا کھیت بھی تھا جس میں بڑے نفیس چاول اگتے تھے۔ اس کی ماں نے اسی پر اکتفا کیا اور اپنے کھیت میں چاول خود اگانے اور اپنی بھیڑیں چرانے لگی اور ان کا دودھ بیچ کر گزارا کرنے لگی۔

اسی طرح پانچ سال بیت گئے۔ لیکن وقت کب پلٹا کھا جائے، کوئی نہیں جانتا۔ ایک دن بڑے زمین دار کے بیٹے نے اس پر قرض کا دعویٰ کیا، اور اس کے کھیت پر اپنا ہل چلوا دیا۔ جب تک بڑے زمین دار صاحب کے ہاتھ پیر درست تھے۔ وہ اپنا حساب کتاب خود دیکھا کرتے تھے اور انہوں نے کسی پر ظلم نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن باگ ڈور اب ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کے بیٹے کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

بنّو کے بابا نے قرض لیا بھی تھا یا نہیں۔ یہ ثابت کرنا اس کی ماں کے بس کا نہ تھا، اس لئے وہ ہار گئی تھی۔ اور اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس کے آدمی بنّو کی ماں کی پوری پچیس بھیڑیں بھی کھول کر لے گئے۔

وقت گزرتا رہا۔اور بنّو پندرہ برس کی ہوگئی ۔ب بھیڑوں کو بنّو ہی چراگاہ تک لے جاتی اور گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ۔لیکن بنّو نے اب تک آئینہ نہیں دیکھا تھ۔اس کی صورت کیسی ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔اس کی ماں اس کی دس بارہ چوٹیاں گوندھ کر اس کی ایک چوڑی چوٹی سب کو ملا کر بنادیا کرتی تھی ۔اور بنّو اسی میں خوش رہتی تھی ۔ایک دن جب جاڑوں کا تھکا ہوا موسم آرام کرنے چلا گیا ور مسکراتے ہوئے سورج کی تیکھی کرنیں برفیلی چٹانوں کے کلیجے میں اترنے لگیں،تو اپنی بھیڑوں کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہوئی وہ ایک **گلیشیئر** کے قریب پہونچی تو وہاں کا منظر اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔اور اس نے پگھلتے ہوئے گلیشیئر کی درار میں ایک گڑیا چھپی ہوئی دیکھی تھی ۔وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی تھی اور جب سورج کی تاریک کرنوں نے گلابی دوپٹہ اوڑھا تو اس دوپٹے کا عکس اس گڑیا کے گالوں پر اتر آیا تھا۔

اس دن وہ دیر سے گھر لوٹی، بھیڑوں کو ان کے باڑے میں بند کیا اور اپنی ماں کے پاس آکر بولی ۔ماں گلیشیئر کی دراروں میں، میں نے آج ایک گڑیا دیکھی ہے،اس گڑیا کو وہاں سے نکلوا کر رنگوا دو ناماں !میں اس سے کھیلوں گی ۔لکڑیوں کو منھ سے پھونک پھونک کر جلانے کی کوشش کرتی ہوئی ماں لمحہ بھر کو رک گئی ۔اور نظر اٹھا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔اور پھر اس کے منھ سے ایک آہ نکل پڑی ۔

’’رنگ بڑے مہنگے ہوتے ہیں بیٹی‘‘۔

اور اتنا کہہ کر وہ پھر چولہا پھونکنے لگی ۔ ماں کی بنائی ہوئی مکے کی روٹی ،لہسن اور مرچ کی کھٹی تیکھی چٹنی کے ساتھ کھا کر بنّو اپنے بستر پر جا لیٹی ۔اس کی ماں اس کی بغل والی کھاٹ پر لیٹی تو لیٹتے ہی تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں کھو گئی ۔لیکن بنّو کافی رات تک نہیں سو سکی تھی ۔اس لئے صبح کو اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی اور وہ جلدی جلدی اپنی بھیڑوں کو لے کر چراگاہ کی طرف چل پڑی اور شام کو جب وہ اپنی بھیڑوں کو لے کر لوٹ رہی تھی ۔تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی اپنے سامنے کئی رنگ لئے بیٹھا ہے اور اس کے آس پاس چلی

مٹی کی کچھ مورتیاں سوکھ رہی ہیں۔

مورتیاں بڑی خوبصورت تھیں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی بتو اس آدمی کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ سامنے والی پہاڑی پر قوس وقزح کے رنگ نکھرے ہوئے تھے۔ جھیل کا پانی دھیرے دھیرے ہلوریں لے رہا تھا، بادام کی شاخوں سے بوند بوند برف گر رہی تھی۔ اور ٹھنڈی ہوا اس کے میلے دوپٹے کو اڑانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

اچانک ایک بوڑھی بھیڑ ممیا اٹھی . اور اپنے کام میں مگن مورتی کار چونک اٹھا اور اپنے پیچھے کھڑی بتو کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس وقت سورج کی گلابی کرنیں بتو کے رخساروں پر سے ہوتی ہوئی اس کے سراپے پر سے گزرتی ہوئی جھیل کی بانہوں میں خود کو چھپا لینے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔

میں "بتو ہوں"

مورتی کار کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر بتو نے دھیرے سے کہا اور مورتی کار مسکرا اٹھا، بتو نے پھر کہا تمہارے پاس بہت سارے رنگ ہیں میری ماں کہتی ہے رنگ بڑے مہنگے ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھے تھوڑا سا رنگ دوگے؟ اس کے بدلے، میں تمہیں سب سے اچھی بھیڑ کا دودھ دے دوں گی۔ مجھے اپنی گڑیا رنگوانی ہے۔ کیا تم میری گڑیا رنگ دوگے؟

مورتی کار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر بولا۔

"تمہاری گڑیا میری بنائی تمام مورتیوں سے زیادہ خوب ہے"۔

اسی وقت سورج نے جھیل میں چھلانگ لگا دی، اور بتو اپنی بھیڑوں کو لے کر لوٹ آئی، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور ماں جنگل سے لکڑیں لانے کے لئے ٹوکرا صاف کر رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ مورتی کار نے اسے بلایا ہے اور اس سے وعدہ کیا ہے کہ گلیشئر کی دراروں میں چھپی گڑیا وہ نکال دے گا اور اس پر ایسے رنگ چڑھا دے گا کہ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی جلدی سے باڑے

میں گئی اور بھیڑوں کے آگے چارہ ڈال کر دودھ دوہنے گی۔

جھیل کے کنارے مورتی کار پہلے سے آ کر بیٹھا ہوا تھا اس نے بتّو کو دیکھ کر کہا۔

"تم جھیل کے کنارے والے بادام کے پیڑ کے نیچے بیٹھ جاؤ اور اپنی آنکھیں بند رکھنا جب تک نہ کہوں نہ کھولنا اور میں تمہاری گڑیا تلاش کرنے جا رہا ہوں"۔

اس کی بات مان کر وہ وہیں بیٹھ گئی صبح دوپہر میں بدلی اور دوپہر شام میں جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج اپنی آنکھیں جھپکا رہا تھا اس نے مورتی کار سے پوچھا۔

"میری گڑیا کہاں ہے؟"

"ابھی تو برف کی صرف ایک ہی تہہ بنا پایا ہوں باقی کام کل کروں گا" مورتی کار نے جواب دیا۔ اور پھر وہ ہر روز وہاں آنے لگی۔ اور مورتی کار نے اس کے حسن کے کئی شاہکار بنا لئے ورانہیں دیویوں کا نام دے دیا۔ اور ایک دن جب وہ وہاں پہونچی تو دور دور تک کچھ بھی نہیں تھا۔ بتّو کو یاد آیا ایک دن اس نے کہا تھا "میں تمہاری گڑیا کے لئے جاپان سے رنگ لاؤں گا وہاں کے رنگ بڑے پیارے ہوتے ہیں"۔ شاید وہ جاپان سے رنگ لانے چلا گیا ہے بتّو نے سوچا اور گھر لوٹ آئی۔ اب وہ ہر روز اس کا انتظار کرتی ور پھر یک دن اس نے مورتی کار کی جگہ ایک دوسرے آدمی کو بیٹھے دیکھا اس کے ہاتھوں میں قلم تھی ور آس پاس بہت سارے کاغذ بکھرے ہوئے تھے بتّو نے اس سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ کیا تم بھی مورتیاں بناتے ہو"

بتّو کی آواز سن کر وہ پلٹا تو وہ کافی دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر اس نے کہا۔

"میں ایک شاعر ہوں اور اپنی شاعری کے لئے موضوع ڈھونڈ رہا تھا۔

لیکن تم کون ہو؟

میں بتّو ہوں اپنی بھیڑیں چراتی ہوں، ان کا دودھ دوہتی ہوں اور گھر کے کام میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں مجھ سے ایک مورتی کار نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میری گڑیا رنگنے کے لئے جاپان سے رنگ لے کر آئے گا اور میں اس کا انتظار کر رہی ہوں"۔

''وہ اب کبھی نہیں آئے گا بتو!

اس نے لاکھوں میں وہ مورتیاں بچی ہیں ان مورتیوں میں یہی رنگ وروپ ہے جو آج میرے سامنے ہے خیر میں دیکھوں گا کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں''۔ شاعر کو اپنی شاعری کے لئے موضوع مل گیا تھا۔ ایک امید لے کر وہ اس کے پاس آتی رہی اور شاعر اپنی شاعری میں رنگ بھرتا رہا۔ اور پھر ایک دن اس نے شاعر کی جگہ ایک مصور کو وہاں کھڑا پایا اس کے آس پاس رنگوں کی بھری بھری کٹوریاں رکھی ہوئی تھیں یہ رنگ بڑے خوبصورت تھے کینوس پر ایک نامکمل تصویر لگی ہوئی تھی۔ رنگوں کی تلاش میں بھٹکی بتو وہاں کھنچی چلی آئی۔

چاروں طرف اندھیرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی اور شام ڈھلے بتو کی بھیڑیں کیسے ہی گھر لوٹی تھیں۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں دھندلی سی لالٹین سنبھالے بتو کی ماں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی اچانک اس کا پیر کسی شے سے ٹکرا گیا اس کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ گئی۔ لالٹین کا تیل زمین پر بہہ گیا اور جلتی ہوئی لو کے شعلوں نے بہتے ہوئے تیل کا دامن پکڑ لیا۔ آگ جل اٹھی تھی زمین سے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس آگ کی روشنی میں دھندلی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا۔ زمین پر رنگ پھیلے ہوئے تھے بادام کے شگوفے نچے ہوئے ہیں وراس کے سامنے اس کی اپنی گڑیا ٹوٹی پڑی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی

گہری تاریک رات تھی۔ چاروں طرف سناٹے کی دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ دور اتری کونے پر نیلا آسمان جمے ہوئے لہو کی مانند سیاہی مائل سرخ نظر آرہا تھا۔ پرندے چیخ چلا کر خاموش ہو کر اب اپنے اپنے گھونسلوں میں جا دبکے تھے کتوں نے بھی رونا بند کر دیا تھا اور کونوں کھدروں میں اپنے اپنے پیٹ کے اندر منہ گھسا کر بیٹھ گئے تھے یا سو رہے تھے ایسی بھیانک رات میں ایک سایہ لڑکھڑاتا ہوا دریا کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے آگے کو جھکے ہوئے تھے جوتے پھٹے ہوئے وہ اپنی چال ڈھال سے بوڑھا اور کمزور لگتا تھا۔

ایسے کمزور اور بوڑھے آدمی کو اتنی رات گئے دریا پر جانے کی ضرورت کیوں آن پڑی تھی آئیے ہم آپ کو بتاتے چلیں۔ شام ڈھلے جب ریڈیو پر یہ اعلان نشر ہوا کہ ”آج کی رات بھیانک طوفان آنے کی سنبھاونا ہے اس لئے کوئی ملاح دریا پر نہ جائے“ تو یہ سن کر وہ مچھلیوں کے ٹھیکیدار کے یہاں گیا تھا یہ بتانے کہ وہ آج اس کے لئے مچھلیاں نہیں لا سکے گا۔ ٹھیکیدار نے جواب میں اسے ڈانٹ پلائی تھی کیونکہ وہ اپنا نقصان کسی بھی صورت گوارا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ چاہے کسی کی جان جائے یا رہے اسے مطلب تھا صرف مچھلیوں سے جیسے بھی ہو اسے مچھلیاں درکار ہوتی تھیں۔ اور اسی لئے اس نے اس بوڑھے کو دریا پر جانے کیلئے مجبور کر دیا تھا بوڑھا بھی جانتا تھا کہ اگر وہ دریا پر نہ گیا تو اسے ایک پیسہ بھی نہ ملے گا۔ گھر میں آٹا نہ ہوگا تو بچیاں بھوک سے روئیں گی۔ وہ ابھی چھوٹی ہیں اور فاقے کرنا نہیں جانتیں۔

ٹھیکیدار ایک ناؤ مچھلی کے اسے بیں روپے دیا کرتا تھا جس سے خود س کا اس کی بیوی کا اور اس کی تین بیٹیوں کا گزارا چلتا تھا۔ حالانکہ اسے ہر پل یہ احساس تھا کہ ٹھیکیدار اس کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے ساری محنت اس کی ہوتی ہے جس سے ٹھیکیدار ہزاروں کما تا ہے۔ بھیانک طوفان میں لہروں کے تھپیڑے سہہ سہہ کر وہ اس کے لئے مچھلیاں پکڑتا ہے اس میں سے ایک مچھلی بھی اپنی بچیوں کے لئے نہیں لاتا بڑی ایمان داری سے پوری ناؤ اس کے حوالے کر دیا کرتا ہے۔

مگر ٹھیکیدار بہر حال بڑی مچھلی تھا اور بڑی مچھیاں ہمیشہ سے چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی آئی ہیں۔ یہ ایک اٹل سچائی تھی اور اس سچائی سے آنکھیں چرانا اس کے بس میں نہ تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی تینوں بیٹیاں لیمپ کی دھندلی روشنی میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایک ہی دھندلا سا لیمپ ان تینوں کے بیچ میں تھا۔ جو تینوں کو ہلکی ہلکی روشنی پہنچا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بوڑھے کو خیال آیا کہ میں بھی اسی لیمپ کی مانند ہوں جو اپنے اندر پڑی تیل کی آخری بوند تک روشنی دیتا رہتا ہے۔ اور یہ میرا ہی فرض ہے کہ آخر وقت تک ان سب کی ذمے داریاں نبھاؤں۔

ٹھیک اسی وقت چھوٹی بچی لپک کر اس کے پاس آگئی اور بولی۔

''بابا آج ہماری ٹیچر نے ہمیں ایک کہانی سنائی۔ چھوٹی مچھلی اور بڑی مچھلی کی انہوں نے بتایا کہ چھوٹی مچھلیاں بھی اکٹھی ہو کر ہمت کر لیں تو اپنی حفاظت خود کر سکتی ہیں۔ کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے بابا۔؟''

بوڑھے نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا وہ چولہا سلگانے میں جٹی ہوئی تھی گیلی لکڑیوں کے دھوئیں سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں بالوں پر تہہ در تہہ راکھ جمتی جا رہی تھی۔

''یہ سب کتابی باتیں ہیں جو تمہاری ٹیچر نے تمہیں سنائی ہیں۔'' بوڑھے نے کونے میں رکھا ہوا بڑا سا جال اٹھایا اور آگ کی روشنی میں اس کے کھلے ہوئے بندھ

جوڑنے لگا۔

''کیا دریہ پر جا رہے ہو''۔ بیوی نے چولہا پھونکتے پھونکتے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

''جانا تو ہوگا ہی''۔ بوڑھے نے گانٹھ باندھی اور کھڑا ہوگیا۔ ''مگر آج تو''۔ بیوی آدھی بات کہہ کر رک گئی۔ ''طوفان آنے والا ہے مجھے معلوم ہے''۔ جب وہ گھر سے نکلا ہوا کچھ اور تیز ہوگئی تھی رات کے بارہ بج چکے تھے بچیاں سو چکی تھیں مگر بیوی اس وقت بھی جاگ رہی ہوگی۔ جب وہ آدھا راستہ طے کر چکا تھا۔

چانک ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اسے کئی قدم پیچھے ڈھکیل دیا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور آگے چلنے لگا ابھی کچھ ہی قدم چلا ہوگا کہ ہوا کے دوسرے جھونکے نے اسے پھر پیچھے ڈھکیلا اور وہ کئی قدم پیچھے ہو گیا۔ اسے سخت غصہ آرہا تھا۔ یہ کمبخت ہوا میرے پیچھے کیوں پڑ گئی کیا بگاڑا ہے میں نے اس کا؟

ہوا اب کچھ تھم گئی تھی وہ پھر آگے بڑھنے لگا تھا تبھی زور کا کڑاکا ہوا اور بجلی کی تیز روشنی چمک کر معدوم ہوگئی اب اس کے سامنے دھوئیں کے بادل امنڈ آئے تھے بجلی شاید ایک پرانے پیڑ پر گری تھی اس کی شاخوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرانا پیڑ زمین پر گر پڑا۔

بوڑھا آدمی سہم کر ایک طرف کھڑا ہوگیا پیڑ اس سے کچھ ہی فاصلے پر گرا تھا۔ یہ پیڑ پرانا مگر بہت مضبوط تھا۔ اس کی طاقت کے آگے اس کمزور بازوؤں والے بوڑھے کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ''بچی بہت معصوم ہے اور اس کی ٹیچر بڑی بے وقوف'' بوڑھے نے سوچا۔

اندھیرے میں راستہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہوا کی نمی نے اسے بتا دیا کہ اب وہ دریہ کے قریب پہنچ گیا ہے۔ کافی دیر ہو چکی تھی چار بجے بھور تک اسے جال کھینچ لینا تھا۔ پانچ بجے صبح مچھلیاں ٹھیکیدار تک پہنچ جانی ضروری تھیں!

اس نے کشتی کھول کر دریا میں اتار دی اس کا بادبان کسا اور چپوار اٹھا کر کشتی کھینے لگا۔ تبھی کشتی کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ پھرکی کی طرح گول گھوم گئی۔ دریا میں بھنور اٹھ رہے تھے۔ اور ابھی جال ڈالنا باقی تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں اژدہے کی پھنکاروں جیسی لگ رہی تھی۔ بوڑھے نے کشتی سنبھالنے کی کوشش کی تو اس کا سر چکرا گیا اور وہ آدھے دھڑ سے کشتی کی دیوار پر ٹنگ گیا۔ کشتی بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ اگر ذرا سی چوک ہو جاتی تو وہ سیدھا دریا میں گر جاتا۔ بہت دیر تک کشتی یوں ہی گول گول گھومتی رہی اور پھر اچانک دریا میں ابھری ہوئی ایک چٹان سے ٹکرا کر رک گئی۔

اس نے اوپر دیکھا تو اس کی سانس اٹک سی گئی۔ چٹان کا ایک کونا اس کی کھوپڑی سے محض آدھے انچ کی دوری پر تھا۔ اگر آدھے انچ کا یہ فاصلہ اسے بچا نہ لیتا تو کشتی کے ٹکرانے کے ساتھ ہی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔

پوری طاقت سے اس نے جال گھما کر دریا میں پھینک دیا۔ ٹھیک اسی وقت بادل گڑگڑائے اور ایک بڑا سا اولا اس کے کم بالوں والے سر پر آ گر کھوپڑی میں ایک گومڑا اٹھ آیا۔

اس نے کشتی کو اسی دریائی چٹان سے باندھ دیا اور اس کے ایک کونے میں خود بھی سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ بار بار چٹان سے ٹکرانے کی وجہ سے کشتی خطرے میں تھی اور مسلسل بارش شروع ہو گئی۔

دھیرے دھیرے بارش کا زور کم ہوا اور آسمان پر سے اندھیرے کا پردہ چھٹنے لگا۔ بہت دور سے کسی مرغ کی بانگ سنائی دی تو بوڑھا آدمی چونک گیا اب جال سمیٹنے کا وقت آ چکا تھا لیکن آج اسے خالی ہاتھ لوٹنا ہوگا بوڑھا جانتا تھا جال میں پھنسے بھی ہوں گے تو محض چند جھینگے۔ برائے نام پیسے ملے بھی تو ٹھیکیدار کی دس باتیں سننے کے بعد ملیں گے۔ یہ سوچ کر اداس بوڑھا جال کھینچنے لگا۔

اچانک اسے لگا کہ جال بہت بھاری ہے۔ اتنا کہ اکیلے کھینچنا مشکل ہے۔ لیکن

اس میں ہو کیا سکتا ہے؟ اس طوفان میں مچھیاں تو نہ جانے کہاں بہہ چکی ہوں گی۔ کوئی گھڑیل یا سمندری اجگر تو نہیں؟ یہ سوچ کر وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ مگر دیکھنا تو ہو گا ہی کہ اس میں ہے کیا؟ پھر اس نے کمر میں ایک رسا باندھ کر اس کا سرا چٹان سے باندھ دیا اور کشتی کے ایک ٹوٹے پٹرے میں پیر گھسا کر اچھی طرح جما لیا اس نے جال کو اوپر کھینچنا چاہا تو جال نے اسے ایک جھٹکے سے نیچے کھینچ لیا بندھا ہوا ہونے کی وجہ سے وہ سنبھل گیا۔

دور دور تک سناٹا تھا ابھی پو ہی پھٹی تھی آسمان پر بادلوں کے کچھ ٹکڑے اب بھی تیر رہے تھے۔

اس نے پھر ہمت جٹائی لیکن اسے الگ رہا تھا کہ آج اسے مر ہی جانا ہے اگر جال کے اندر گھڑیال یا اژدہا ہوا تو جال سے نکلنے کے ساتھ ہی اسے نگل جائے گا۔

اچانک بجلی چمکی اور کچھ دیر تک چمکتی رہی۔ روشنی کے جھمکے میں جال جھلکا تو اس کے منھ سے حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ وہ مچھلی ہی تھی بہت بڑی اور بہت خوبصورت اتنی بڑی مچھلی آج تک کسی کو نہیں ملی تھی۔

''یہ مچھلی تو میوزیم میں رکھوانے کے لائق ہے''۔ بوڑھے نے سوچا اور پوری طاقت سے جال کھینچنے لگا مگر جال وہیں کا وہیں رہا۔ تب اسے ایک ترکیب سوجھی، جال کو پانی میں ہی پڑا رہنے دیا جائے صرف اس کا منھ بند کر کے ایک سرے کو کشتی میں باندھ دے۔ صبح ہوتے ہی اس راستے سے کچھ لوگ گزریں گے انہیں بلا کر دو چار لوگ مل کر جال کھینچ لیں گے۔ ہوا اس کی مددگار ثابت ہوئی۔ وہی جو رات اس کی دشمن بن کر اسے پیچھے دھکیل رہی تھی اب اسے کنارے کی طرف لے جا رہی تھی کشتی کی پشت سے جال کا ایک سرا بندھا ہوا تھا۔

اچانک جال کو جھٹکے لگنے لگے لگتا تھا کہ اس کے اندر ایک دوسرے سے کوئی برسرِ پیکار ہے۔ ہوا موافق ہونے کے باوجود جال کا وزن بڑھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جال کی طرف کشتی ایک طرف سے جھک گئی تھی۔ کشتی کھیتے کھیتے بوڑھے کے بازو شل ہوئے

جاتے تھے اعصاب چور چور اور پھٹے کپڑے کچھ اور پھٹ گئے تھے۔ وہ پھر بھی پُر جوش تھا کئی برسوں کے بعد ایک معقول کمائی کی امید ہاتھ لگی تھی۔

آسمان کے کناروں پر کئی رنگ پھیل گئے تھے۔ چڑیاں چہکنے لگی تھیں اور دور دریا کے کنارے جنگل میں سے ایک سایہ نکلتا دکھائی دے رہا تھا خدا نے آخر مدد کے لئے کسی کو بھیج ہی دیا، یہ سوچ کر بوڑھے نے ہاتھ کا بھونپو بنا کر زور سے اسے پکارا

.. ..

جلد ہی اسے اس کی آواز سنائی دے گئی۔ وہ ادھر گھوم گیا بوڑھے کی ہمت کچھ بڑھ گئی اور پورے جوش کے ساتھ اس نے کشتی کھینی شروع کر دی۔

اب جال ہلکا لگنے لگا تھا۔ پھر بھی بہت بھاری تھا۔ دونوں نے مل کر جال اوپر کھینچ ہی لیا۔

اچانک بوڑھے کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

جال میں ان گنت چھوٹی مچھلیاں گھسی ہوئی تھیں۔ اور بڑی مچھلی کو کتر کر کھا رہی تھیں۔ جال میں پھنسی بڑی مچھلی انتہائی بے بس اور مجبور نظر آ رہی تھی اچانک بوڑھے کو خیال آیا۔

''ٹھیک ہی کہتی ہے میری چھوٹی بٹیا، چھوٹی مچھلی بھی بڑی مچھلی کو کھا سکتی ہے۔ ضرورت صرف ہمت کی ہے۔'' اور یک نئے عزم کے ساتھ بوڑھا آدمی فش مرچنٹ'' کے ڈیرے کی طرف چل پڑا!!

☆☆☆☆☆☆

لٹو

وہ ہمیشہ اپنے محور پر گھومتا تھا، کسی ننھے سے بچے کی ہتھیلی پر ناچتے ہوئے لٹو جیسا۔

نیوی آفیسر بلبیر نے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے، باہر خلاؤں میں دیکھتی ہوئی ریشما کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

ریشما کی آنکھیں بوجھل اور اداس تھیں۔ اس نے پیالی اٹھا کر چائے کا ایک گھونٹ لے لیا، اور بولی۔

''شاعروں، ادیبوں، اور مصوروں کا ہمیشہ سے یہی طور رہا ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارے ہی وجود کا ایک ٹکڑا توڑ کر اور اسے ذرا سا جھاڑ پونچھ کر ہمارے ہی سامنے پیش کر کے خود کو ایک شاہکار کا موجد ٹھہرا کر اپنی حیثیت منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''یہ وہ داستان نہیں ہے۔ ریشما میں جانتا ہوں تم نے اپنی زندگی میں جو کچھ جھیلا ہے، جن حالات سے گذری ہو، وہی تلخ تجربات تمہیں ایسا کہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ لیکن میں جو ایک ریٹائرڈ نیوی آفیسر ہوں اور اپنی زندگی کے ان گنت دن پانی کی لہروں پر گزار چکا ہوں، خشکی اور تری کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ایسی راہوں سے گزرا ہوں جہاں تصور کی اڑانیں بھی مشکل سے پہنچ پاتی ہیں۔ اور ان تمام تجربات سے گزر کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وفا اور بے وفائی کسی کی میراث نہیں ہوتے۔ کبھی وفاداری کا حلف اٹھانے والا موت سامنے دیکھ کر ساتھ چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو کبھی وہ جس نے کوئی وعدہ

نہیں کیا کام آجاتا ہے اور جب ان تمام حالات سے گزر کر میں نے اپنے تجربات لکھنے
شروع کیے تو ایک قلم کار بن گیا۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ نئی زندگی کی شروعات کرتے
ہوئے تمہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ ہو۔''

ریشما نے چائے کی پیالی اٹھائی اسے ہونٹوں کے پاس لے گئی، ذرا سا رکی اور
پھر ایک ہی گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر کے بولی۔

''میں نے آپ کی کہانی سننے سے انکار نہیں کیا سر! لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ
آپ کی سنائی داستان پر مجھے یقین بھی ہو۔''

بلبیر سنگھ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

''اس کے لئے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔'' دریا کی طرف سے آتی ہوئی ہوا
کچھ تیز ہو گئی تھی۔ بلبیر نے اپنے کوٹ کا کالر کھڑا کر کے اپنے کانوں کو ڈھک لیا۔

کیتلی میں بچی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ریشما نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا شیشے
والا پٹ اور بڑھ لیا۔

رنگین شیشوں کے پیچھے سے دریا کنارے کا منظر اور بھی خوبصورت نظر آنے لگا
تھا۔ بلبیر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور کہنا شروع کیا۔

''وہ ذات کا موچی تھا۔ اسی لئے جب وہ حاضری گھر کی طرف آتا دکھائی دیتا۔
سامنے لگی ہوئی بھیڑ چھٹ کر کنارے کنارے کھڑی ہو جاتی، برہمن اور اونچی ذات
والے صاحب دور دور ہٹ جاتے۔

کیوں کہ انہیں ڈر تھا کہ اس کے کندھے پر ٹکے سوا گز لمبے ڈنڈے کی نوک پر
بندھے اس کے جوتے کہیں ان کے شریر سے چھو نہ جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ان کی پوترتا
پر آنچ آجاتی۔ لیکن وہی صاحب لوگ اس سے اپنے ٹوٹے جوتے گنٹھوانے میں ذرا بھی
نہ ہچکچاتے کیوں کہ وہ ایک اچھا کاریگر تھا اور ان لوگوں کے جوتے مفت میں ہی دیتا تھا۔
کمپنی سے ملے بے ڈھب جوتوں کو کاٹ چھانٹ کر نکھرا ہوا روپ دیدیتا تھا۔ اسی لئے

اس کمپنی میں کام کرنے والے مزدور سے صاحب تک اسے آتے دیکھ اس کا راستہ چھوڑ دیتے تھے اور اسے سب سے پہلے حاضری بنوانے کا موقع دیدیتے تھے۔

لیکن سے کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ سیدھے آتا اور چلا جاتا، رات بھر ڈیوٹی کرتا، صبح جوتوں کا بازار لگاتا۔ اسے صرف پیسوں کی فکر تھی وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے سورجی سے بہت پیار تھا۔ اس نے سورجی سے کہہ رکھا تھا کہ جس دن وہ بہت سارے پیسے یعنی پورے ایک لاکھ روپئے جمع کرے گا اس دن سے جوتے سینا چھوڑ دے گا۔

کیوں کہ سورجی کو چمڑے کی بو نہیں بھاتی تھی۔ ان سب کے باوجود اسے رنگوں کی تمیز نہیں تھی، کیوں کہ اس کا سارا جیون گہرے بھورے نیلے اور کالے رنگوں کے بیچ بیتا تھا۔ اسی لئے وہ سمجھتا تھا کہ سورجی کے بادامی رنگ پر ایسے ہی رنگ زیادہ پھبیں گے اور سورجی موچی کی بیٹی ہوکر بھی ایسی لگتی تھی، جیسے دودھ اور گلاب سے نہا کر آئی ہو۔

س کی آنکھوں میں بسنت کے رنگوں کا خمار تھا اور ذہن میں پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

مگر موچیوں کی بھی اپنی ایک پرمپرا ہوتی ہے، ان کے اپنے اصول ہوتے ہیں، اپنی آن ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے رشتے اپنی برادری سے باہر نہیں ہوسکتے تھے۔

اور سورجی کے لئے اس وقت لٹو سے اچھا اور اس کے ماں باپ کی نظر میں کوئی نہ تھا۔

لٹو سچ مچ لٹو ہی تو تھا۔ گول مٹول بھولا بھالا، سیدھا سادا، سا۔ اس کے پاس کہیں کوئی چھل نہ تھا۔ شاید اسی لئے گاؤں سے کام کی تلاش میں شہر میں آئے سرجو کے لئے اس نے کھلے دل سے اپنی باہیں پھیلادی تھیں اور اسے کمپنی کی طرف سے ملے اپنے چھوٹے سے کوارٹر کا ایک حصہ دے دیا تھا۔

سرجو گاؤں میں سورج مکھی کی کھیتی کرتا تھا، اور گاؤں کے زمین دار کے باغیچے کی

رکھوالی بھی کیوں کہ وہ ذات کا مالی تھا۔لیکن اس سال سوکھا پڑ جانے کی وجہ سے اسے گاؤں چھوڑ کر یہاں کام کی تلاش میں آنا پڑا۔اس کے آتے ہی ور سر جی کی آنکھوں میں ایک بار پھر بسنت مسکرانے لگا تھا۔

لٹو کو سرجو پر پورا وشواس تھا،اس لئے وہ اور بھی جی جان سے اپنے کام میں جٹ گیا۔

اب اسے سرجی کی زیادہ فکر نہیں کرنی پڑتی تھی ، کہ وہ اکیلے گھر میں بیٹھی اس کی باٹ جوہ رہی ہوگی۔

اب سرجو،سورجی کے ساتھ صبح کی چائے پیتا تھا، پیسے کمانے کی چاہت لٹو کو بہت سویرے گھر سے کھینچ کر باہر لے جاتی تھی۔

ایک بار لٹو کو اوور ٹائم کرنے کا موقع ملا۔اسے اس دن، دن میں بھی ڈیوٹی کرنی تھی۔کیوں کہ اس کا ساتھی چوکیدار بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے جلدی جلدی چھٹیاں لینے لگا تھا۔لٹو خوش تھا کہ اس ہولی کی تہوار پر اسے دوگنی تنخواہ مل جائے گی۔اس لئے باقی کا کام اس نے سرجو کے ذمے کیا اور دوہری ڈیوٹی کرنے لگا۔

خوبصورتی اگانا سرجو کی عادت تھی۔اس لئے اس نے بڑی خوبصورتی سے لٹو کی دیواروں کو سجا دیا اور اس کے آنگن میں گلاب کا ایک پودا لگا دیا۔لٹو نے یہ سب دیکھ اور پھر سرجو کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھما کر اس سے بولا۔

''لے بھیا،اب اپنی بھوجی کے لئے ساڑیاں بھی تو لے آ''۔

اور سرجو کی لائی ہوئی ساڑی پہن کر جب سورجی لٹو کے سامنے آئی تو اسے لگا اس کے آنگن میں پورا کا پورا بسنت اتر آیا۔

''تیری لائی ساڑی نہیں پہن کر تو تیری بھوجی گیندے کے پھول کی طرح کھل گئی ہے،سرجو۔''

ہولی کے ایک ہفتے بعد ایک دن سرجو نے لٹو سے کہا۔

''تم کہو تو میں بھوجی کو کلکتہ گھما کر لے آؤں، دیکھتا ہوں کہ تمہیں تو فرصت ہی نہیں ملتی''۔

یہ سن کر لٹو کا یقین سرجو پر اور بھی پکا ہو گیا۔ دن رات کام کرنے کی وجہ سے ایک دن لٹو بیمار پڑ گیا۔ لوگ اسے اسپتال لے گئے، ہسپتال سے لوٹنے کے بعد سبھوں کی رائے ہوئی کہ لٹو کو دو آدمی ساتھ جا کر اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ لٹو کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پورا گھر خالی پڑا تھا۔ اور اس کے آنگن میں ایک اکیلا پیلا سا گلاب کھڑا لو کے تھپیڑے سہ رہا تھا۔ لٹو کے جیون بھر کی کمائی بھری دوپہری میں لٹ گئی تھی! اس بات کو پورے بیس سال بیت گئے ہیں۔ لیکن لٹو کو آج بھی اس کا انتظار ہے وہ ہر آنے جانے والے سے پوچھتا پھرتا ہے کہ کیا اس نے کلکتے میں سرجو اور سورجی کو دیکھا ہے؟

کیپٹن بلبیر کے گلے میں بلغم اٹک گیا تھا۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا رومال سے ہونٹوں کو پونچھ اور ذرا سا آگے جھک کر بولے۔

''تم سن رہی ہو ریشما؟''

ریشما نے ان کی طرف آنکھیں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو بوندیں گر پڑیں۔

''آپ اس بار پورے پانچ سال بعد یہاں آئے ہیں نا سر؟''

''ہاں۔''

''اس بیچ اس کے انتظار کی شدت کم ہو گئی ہو''۔

''کون جانے''۔ بلبیر سنگھ نے ٹھنڈی چائے حلق میں انڈیل لی۔

ریشما دور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ''کوئی ادھر آ رہا ہے سر! سر سے پیر تک اجلا سفید، جیسے برف کا آدمی ہو۔'' اجلے بال، اجلے کپڑوں والا ایک بوڑھا، سہارے کے لئے ایک لاٹھی، ہاتھ میں پکڑے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا جھکا اپنی دھندلی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور کانپتی آواز میں بولا۔

’’آپ اتنے دن کہاں رہے بابو جی؟ اس بیچ کسی نے میری چٹھی نہیں لکھ دی سبھی ہنسی اڑاتے ہیں میری۔‘‘ ’’بابو تو آپ تو سچے آدمی ہو، ان سب کو بتا دو نا کہ تم نے سرجو کے نام چٹھی لکھ دی ہے۔ سرجو لوٹے گا تبھی تو سورج بھی لوٹے گی۔ اس نے تو رستہ ہی نہیں دیکھا‘‘۔ پھر وہ ذرا سا آگے بڑھا اور کیپٹن کے کان کے پاس منھ لے جا کر دھیرے سے پھسپھسایا۔

سچ سچ بتا دو نا! آپ تو لیکھک ہو جھوٹ نہیں بولو گے۔ ہا رسرجو کب لوٹی بابو؟؟

☆☆☆☆☆☆

قیدحیات

عظمت علی خاں عرف اچھن مرزا کی زندگی کا چراغ بجھ جانا لوگوں کے لئے حیرت کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ کئی مہینوں سے بن تیل کے دیئے کی طرح جھلملا رہے تھے!

حیرت کا باعث کچھ تھا تو بس یہ کہ اتنی وفا شعار اتنی خدمت گزار بیگم اچھن مرزا کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

نوابی اور شہنشاہی کا دور تو بہت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔مگر بیتے دنوں کی کچھ روایات اب بھی قائم تھیں۔

ان کے گھر میں ایک مغلانی بی کے علاوہ دو تین نوکر اور ان کے بال بچے بھی تھے۔

اجداد کے چھوڑے ہوئے اثاثے میں بس یہ حویلی بچی ہوئی تھی۔اور اس کے چاروں طرف ایک باغیچہ تھا۔باغیچے کے اندر ہی ایک خاندانی مسجد اور دو چھوٹے تالاب بھی تھے۔جن میں کبھی گلابی سفید اور پیلے کنول کے پھول مسکرایا کرتے تھے۔اور ان کے چاروں طرف دور دور تک طرح طرح کے پھلوں کے علاوہ بادام اور اخروٹ کے بھی کئی درخت تھے۔اور بادام کے شگوفے پھوٹتے ہی زندگی مسکرا اٹھتی تھی۔

لیکن اب تالاب میں مچھلیاں پالی جارہی تھیں اور بادام کے شگوفوں کی بجائے۔ بھنڈی بیگن کے پھول دکھائی دیتے تھے۔اور اں ہی چیزوں سے گھر کے نوکروں کا گزارا ہوتا تھا۔اور نواب صاحب ایک فرم میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر فائز تھے۔

لیکن وقت اور حالات کے بدل جانے کے باوجود نواب اچھن مرزا کا ایک شوق اب بھی قائم تھا۔ شکار کا شوق اور چھٹیوں کے دن وہ اکثر شکار کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ اور شکار کے اسی شوق نے انہیں ایک دن بلقیس بانو کے در پر لا کھڑا کیا تھا۔

شکار کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے وہ ایک دن جنگل کی دوسری جانب جا نکلے تھے۔ جہاں جنگل کے آخری سرے پر بلقیس بانو اپنی تین چھوٹی بہنوں اور ضعیف بابا کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے بابا جنگل کے کنارے والے کھیتوں کی رکھوالی پر مامور تھے اور اس کام کی انہیں بہت معمولی تنخواہ ملا کرتی تھی۔ جاڑا ہو یا برسات گرمی ہو یا سردی، رات کو خدا سے لو لگائے ہاتھ پھیلائے اس کے حضور میں فریاد کیا کرتے تھے کہ کوئی ایسا خدا کا بندہ کبھی اس راستے سے گزرے جوان کی بیٹی کا آنچل تھام کر اسے اپنے گھر لے جائے تاکہ موت کے بعد ان کی روح بھٹکتی نہ رہے کہ وہ اپنی بچیوں کو بے سہارا چھوڑ آئے ہیں۔

برسات ابھی ابھی گزری تھی۔ جنگل کے درخت دھل کر نکھر گئے تھے۔ رنگ برنگی چڑیاں چہک رہی تھیں۔ اور ہریالی کی خوشبو میں لپٹی ہوا دل و دماغ کو معطر کئے دے رہی تھی۔

ایسے ہی ماحول میں اچھن مرزا راستہ بھول کر ادھر جا نکلے تھے۔ اور اسی وقت ان کی بھٹکن کام آ گئی تھی۔ اور بوڑھے بابا کی دعا قبول ہو گئی تھی۔

پینتالیس برس کی عمر ہو جانے کے باوجود اچھن مرزا نے شادی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ لیکن اچانک ہی یہ بن دیوی ان کے وجود کو بسنتی رنگ میں نہلا گئی تھی۔ اور جنگل سے لوٹنے کے فوراً بعد ہی انہوں نے بلقیس بانو کے بابا کے پاس پیغام بھیج دیا۔

ہفتے بھر کے اندر ہی بن کی دیوی حویلی کی مالکن بن گئی اور خود کو حویلی کی دیواروں کے ذرے ذرے میں سمو دیا۔

اچھن مرزا نے بھی اپنی ذمے داری پوری طرح نبھائی ان کے بابا کو بے انتہا

عزت بخشی اور تینوں بہنوں کی شادی اچھے گھروں میں کرادی۔ ان کی شادی کا پورا خرچ اٹھایا۔

بلقیس بانو نے اپنے بابا کی بہت خدمت کی تھی اور شادی کے بعد شوہر کا بھی اتنا ہی خیال رکھا۔ان کی ہنسی ہنستی اور ان کے آنسو رویا کرتی اور شاید یہی وجہ تھی کہ آنے والے ان کی خشک آنکھوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے اور کریدنے کی کوئی راہ نہ پا کر اپنے آپ میں الجھے، جھلاہٹ کا شکار ہو کر الفاظ کے ناخن کریدر ہے تھے۔

رسم ماتم کی خانہ پری کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔تبھی مغلانی بی نے رشتے کی ایک بہو کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”اے بی بی! کیا بات ہے؟ سب لوگ اپنی اپنی جگہ لینے لگے۔ بلقیس بانو، اکیلے سوئیں گی کیا؟ چالیسویں تک تو کم سے کم کوئی ان کے ساتھ رہو پھر تو اکیلے ہی سونا ہے زندگی بھر۔“

بلقیس بانو ابھی بھر پور جوان تھیں اور مغلانی بی سے ان کی بیوگی کا دکھ نا قابل برداشت ہوا جاتا تھا۔

”آپ ہی سو رہیئے نا بوا، اور کون پڑا ہے یہاں خالی خولی کبھی تو اپنے اپنے بال بچوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ بڑی بہو ابھی پوری بات کہہ بھی نہ پائی تھیں۔ کہ اچانک بلقیس بانو کی آواز گونج اٹھی۔

”نہیں، یہاں سونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بی بی آپ خود ہی ضعف کا شکار میں جائیے اپنی جگہ جا کر آرام کیجئے۔“

”لیکن دلہن۔“

’’میں اب کسی کی دلہن نہیں رہی مغلانی بوا، برسوں سے اس کمرے میں قیدی بن کر رہی ہوں۔ اب آج کی رات تو مجھے اکیلا چھوڑ دو۔‘‘

دھیرے دھیرے بڑبڑاتے ہوئے انہوں نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

پھر انہوں نے اگربتی جلائی اور قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئیں۔ سامنے کھونٹی پر ٹنگا ہوا مرزا کا کرتا پنکھے کی ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

قرآن پاک بند کر کے انہوں نے کرتے کو کھونٹی سے اتارا اور سامنے رکھے بکس میں ڈال کر ڈھکن بند کر دیا۔ پھر انہوں نے کمرے کی دیواروں کو دیکھا، فرش کو دیکھا اور یہاں چھپے ہوئے گہرے سنّاٹے کو محسوس کیا۔

آج یہ کمرہ انہیں ایک دم ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔ نہ کھانسی تھی نہ کراہیں۔ گھڑی کی سوئیاں بھی رکی ہوئی تھیں۔

سامنے پلنگ پر اُجلا بے شکن بستر بچھا ہوا تھا۔

سامنے آئینے میں ان کا مکمل سراپا دکھائی دے رہا تھا۔ سفید لباس، چوڑیوں سے خالی کلائی، کاجل سے خالی آنکھیں، گجروں سے بے نیاز کھلے ہوئے سیاہ بال، گہنوں سے خالی گردن۔

اسی لمحے انہیں ایسا محسوس ہوا کہ آج وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی ہیں۔ ان کے کاندھے سے سارا بوجھ اتر گیا ہے۔ اب وہ آزاد ہیں زندگی کی ہر قید سے۔

پھر وہ اُجلے بے شکن بستر پر لیٹ گئیں لیٹے لیٹے ادھر سے ادھر لڑھکنے لگیں۔

’’آج سے یہ بستر میرا ہے میرا اپنا۔ اس کا ساجھی کوئی نہیں۔‘‘

وہ اپنے آپ بڑبڑائیں۔ اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔

انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر اجلی بے شکن چادر کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔
اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ یہ آنسو کیسے تھے؟
آزادی کی خوشی کے یا جدائی کے غم کے؟؟ دروازے کی جھری سے جھانکتی کئی
آنکھوں نے یہ منظر دیکھا لیکن کوئی کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔!!

☆☆☆☆☆☆

تجھ سے پوچھوں ایک سوال سکھی ری

اوری میری سکھی!"

آج پھر میں تیری کھڑکی پر آ بیٹھی ہوں۔ میں ایک ننھی سی چڑیا اوپر بہت دور آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے کرتے تھک کر چور چور ہوگئی ہوں۔ میرے اندر سے درد کی لہریں اچھل اُچھل کر مجھے بے چین کئے دیتی ہیں۔

میں اتنی بے چین کیوں ہوں؟ میری چنچل آنکھیں اداس کیوں ہیں؟ یہ سب تو نے مجھ سے ابھی ابھی پوچھا ہے نا۔ لیکن آج میں تیری باتوں کا جواب نہیں دونگی۔ کیونکہ مجھے خود تجھ سے کچھ پوچھنا ہے آج تجھے میرے سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔

جب بھی تیرے من میں پیڑا کی لہریں اٹھیں میں آ کر تجھے شانت کرتی رہی تجھے تسلیاں دے دے کر بہلاتی رہی ہوں۔ لیکن آج میرے اندر جو کچھ گذر رہی ہے میرے انتر من میں جو کچھ گھٹ رہا ہے۔ اس کا علاج کس کے پاس ہے؟ کیونکہ آج میں نے جو منظر دیکھا ہے اس منظر کو اگر تو نے دیکھا ہوتا تو ٹوٹ کر چور ہو جاتی۔ شاید نہیں بھی ہوتی۔ جیسے کہ وہ نہیں ہوئی، اس نے اس کے لٹنے کا تماشہ دیکھا اور خاموش رہی۔

اے یشوداماں اور رادھا کی ہم جنس۔ حوا کی بیٹی، تو نے اپنی ہی طرح کی ایک پوتر نا کی مورت کو چور چور ہوتے دیکھا اور اف تک نہ کی؟ کاش اس وقت تو نے اپنے درد کو یاد کیا ہوتا۔ کیا وہ کی ہی پیڑا ویسا ہی درد تیری اس بہن اس بیٹی کے دل میں نہ ہوا ہوگا؟

''برتن گرے گا تو آواز ہوگی ٹوٹے چاہے نہیں۔ آواز تو سب نے سن لی نہ۔؟ یہ باتیں تو نے ہی کہی تھیں نا؟ یا تیری ہی جیسی کسی اور عورت نے کہی ہونگی۔ تب تو نے اس کے دردکو سمجھنے کی کوشش کی تھی یا اس درد کی سیاہی سے اپنے قلم کو جلا بخشنی چاہی تھی۔ لیکن تو نے اس کے اندر جھانک کر اس کے درد کے سوتے کو نہیں ڈھونڈا تھا اور اس درد کے بوجھ کو ڈھوتی ہوئی وہ عورت آج تک بڑبڑا رہی ہے۔ خود کو ایک بہت اچھی زبان داں محسوس کرتی ہوئی۔''

''شی یوز پرابلم از مائی پرابلم'' اور اس کی یہ بے تکی باتیں سن کر اس کا شوہر ہنستا ہوا کہتا ہے۔'' بھابھی سن کر اس کا نام پگلا واللہ رکھ دیا ہے بہت بکتی ہے یہ اس کی بات پر دھیان نہ دیجئے گا۔''

ٹانگ سے لنگڑا اور ایک آنکھ سے بھینگا سا آدمی ہے اور اپنی اس بیوی کا رشتے میں ماما لگتا تھا۔ جب اس کی عمر ڈھلنے لگی اور کسی نے اسے چارا نہیں ڈالا تو وہ اپنی چودہ برس کی بھانجی کو سنیما دکھانے کے بہانے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا اور اسے آٹھ دن تک ایک کمرے میں بند رکھا۔ اور زبردستی اسے اپنی بیوی بن جانے پر مجبور کر دیا۔ اس بچی کی ماں نے یہ سب اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کچھ بھی نہ کرسکی تھی۔

او میری سہیلی تو ہی بتادے نادرگا اور کالی کا روپ دھارنے والی عورت اس وقت اتنی کمزور اتنی بے بس اتنی شکتی ہین کیوں بن گئی تھی؟ ایسے ہی کبھی ایک سو سہیلی ہوا کرتی تھی۔ سپنے دیکھنے والی، نیلی نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی۔ وہ سپنوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اور سپنوں ہی سپنوں میں اس کی قبر بن گئی تھی۔ کیونکہ اس نے ایک حس پال لی تھی اپنے اندر اور ایک سچ نہیں دیکھ سکی۔ کاش اس نے کاغذ اور قلم پھینک دی ہوتی۔ اور وقت کا دیا ہوا زہر کا پیالہ پی جاتی۔

لیکن وہ سمجھ نہیں پائی اور اپنے لئے چنا سادہ کورا کاغذ جس پر وقت کی انگلیوں نے نشان نہیں ڈالا تھا۔ اس لئے سہیلی کی کوئی یادگار نہیں بن سکی اور کالے سیاہ پتھروں کے نیچے اس کی قبر بن گئی۔ آج کوئی نہیں جانتا کہ ان کالی پہاڑیوں کے نیچے ایک سہیلی دفن ہے۔ اور

نہ جانے کب تک کتنی ہی سپنیلیاں اسی طرح دفن ہوتی رہیں گی۔

تو نے ابھی ابھی پوچھا ہے؟ سپنیلی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ جبکہ وہ بہت خوبصورت گیت لکھا کرتی تھی؟

''وہ ایسے ہوا میری سہیلی! کہ جیسے ایک عورت کے سامنے دوسری عورت کی پاکیزگی چھین لی گئی۔ تو بھی تو خود کو بہت آدرش وادی اور بہت ہمت ور سمجھتی تھی نا۔ لیکن تو کچھ بھی تو کر نہیں سکی۔''

''یک عورت کو سپنیلی کی جھونپڑی پسند آ گئی تھی اور وہ بہانے بہانے آ کر اس کی جھونپڑی میں رہنے لگی۔ پھر اس نے اس کے اثاثے پر قبضہ کرنے کی نیت سے سپنیلی کو زہر پلا دیا۔ سپنیلی زندہ تو بچ گئی لیکن پھر کبھی گیت نہیں لکھ سکی۔ اس کی پیاس امر ہو گئی بہت پیاسی ہو گئی تھی سپنیلی۔ اور اس پیاس کی ذمے دار وہ دوسری عورت تھی۔ سپنیلی ایک دن بہت روئی تھی یہاں تک کہ اس کے آنسوؤں سے کسی کی پیاس نہیں بجھتی۔ اور سپنیلی اپنے ہی لکھے گیتوں کا کفن اوڑھ کر ان کالی چٹانوں کے نیچے سو گئی۔''

اب سے ہزاروں برس پہلے بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک عورت کے بیٹے نے اپنی ماں سے کہا تھا۔

''دیکھ ماں میں کیا لایا ہوں تیرے لئے۔'' اور ماں نے پیچھے پلیٹ کر دیکھے بنا کہہ دیا تھا۔

''پانچوں بھائی بانٹ کر لے لو۔'' اور پھر اس چیز کو پانچ ٹکڑوں میں بانٹ لیا گیا۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کیا کسی نے اس کے درد کو محسوس کیا تھا؟ اس کی گھٹی گھٹی چیخوں کو سنا تھا؟

''نہیں ------۔'' کیونکہ اس چیز کو آپس میں بانٹنے والے پانچ بھائی تھے۔ اور وہ اکیلی تھی۔ وہاں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ ماں اپنے پانچ بیٹوں کے لاڈ میں لین تھی۔ اس لئے اس نے اپنی ہی جیسی ایک عورت کے درد کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اگر یہ سب خود اس کے اپنے ساتھ ہوا ہوتا؟ تو کیا تب بھی وہ درد سے نہ تڑپ اٹھتی؟ پھر یک دن اس پانچ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی عورت کا چیر ہرن بھرے دربار میں کیا گیا تھا اور یک اور عورت اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے اس کے سامنے سنہاسن پر بیٹھی رہ گئی تھی۔

آج جبکہ آسمان کی گہرائیں اور اونچائیاں ناپی جا رہی ہیں آدمی کے ہاتھ چاند اور ستاروں کو چھو رہے ہیں۔ زمین آسمان کی دوریاں گھٹ چکی ہیں کیا عورت آج بھی اتنی ہی مجبور اتنی ہی شکتی ہین ہے؟

اگر نہیں تو یہ سب کیوں ہوا؟ وہ منظر جو ابھی میں دیکھ کر آئی ہوں۔ میں ایک ننھی سی چڑیا اور میری آنکھوں میں جھانک کر تو بھی وہ منظر دیکھ لے۔ جسے دیکھ کر میرا انتر من میرے دل کی گہرائیاں تڑپ اٹھی ہیں۔ کیا میرا بے چین ہونا، میری تڑپن کوئی بیکار سی شے ہے؟

دیکھ وہ سامنے والا چبوترہ پر کتنی بھیڑ جمع ہے وہاں آ۔ میں تجھے بتاتی ہوں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

وہ ایک پنچایت ہے۔ اور اس پنچیت میں جوانوں کے ساتھ بزرگ لوگ بھی شامل ہیں۔

آج وہاں ایک مرد کو سزا سنائی گئی ہے۔ جانتی ہو یہ سزا کیسی ہے؟ نہیں جانتی نا۔ تو دیکھو غور سے دیکھو۔ مرد کے قصور کی سزا میں ایک عورت کو جو اس مرد کی ہی گھر والی ہی گھسیٹ کر میدان میں لایا جا رہا ہے۔

اس عورت کے ساتھ پنچایت کے فیصلے کے مطابق دوسرے مرد کو وہی کچھ کرنا ہے جو اس عورت کے مرد نے پہلی عورت کے ساتھ کیا تھا۔ اس طرح وہ پہلی عورت بھی چپ چاپ ایک اور عورت کے لٹنے کا تماشہ دیکھنے کو تیار کھڑی ہے اور میری سکھی تو ہی بتا نہ اس مرد کا کیا بگڑ گیا ہے۔ جس نے اس عورت کے ساتھ زنا بالجبر کیا تھا۔ پاکیزگی کی ایک اور مورتی چور ہو گئی ہے۔ پنچایت فیصلہ سنا کر خوش ہے اور دونوں مرد ایک نئی لذت سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ تو چپ ہے تو بھی میرے سوال کا جواب نہیں

دے پائی۔ اوراب میرے پاس س کے سوا چارہ نہیں کہ اوپر آسمان کی وسعتوں میں کھو جاؤں کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لئے۔ میرا دل رو رہا ہے روتا رہے گا رو چکا ہے۔ ہزاروں برس پہلے بھی اور شاید ہزاروں برس بعد بھی روتا رہے گا۔ اور میں اڑتی رہوں گی۔ تب تک جب تک میرے پر ٹوٹ نہیں جاتے اوری میری سہیلی۔ جب جب آسمان سے بوندیں ٹپکیں سمجھ لینا یہ میرے آنسو ہی ہیں اور یاد کر لینا اس دن کو جب ایک ننھی سی چڑیا تمہاری کھڑکی پر آ کر بیٹھی تھی اور تم اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکی تھیں۔ اور وہ ننھا سا پنچھی ہر بدلتے موسم میں دھرتی اور آکاش سے، چاند سے، بادلوں سے، ستاروں سے یہ سوال پوچھنے آتا رہے گا۔

☆☆☆☆☆☆

وادی کا گیت

سارہ اپنے والدین کی اکلوتی بچی تھی۔ اس کی ماں اس کی پیدائش میں ہی گزر گئی تھی۔ بابا نے دوسری شادی نہیں کی۔

سارہ جب پانچ سال کی ہوگئی تو اس کے بابا نے س کی بسم اللہ شروع کرائی۔ وہ بہت ذہین بچی تھی۔ اس لئے جب اس گاؤں میں نیا نیا اسکول کھلا تو باہر کے کئی لوگ معائنے کے لئے آئے۔ اور سارہ کا گھر چونکہ کافی بڑا تھا اس لئے وہ وگ وہیں ٹھہرائے گئے تھے، انہوں نے سارہ کو دیکھا تو اس کی ذہانت سے بے حد متاثر ہوئے اور اس کے بابا سے کہا کہ اس بچی کو خوب پڑھایا جانا چاہئے۔

مگر اس وقت تک لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کا رواج شروع نہ ہوا تھا، خاص کر اس علاقے میں۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ لڑکی اسکول میں پڑھائی جانے والی ہے تو بہت لے دے ہوئی، ایک نہ دو، پورے دس گاؤں جو آس پاس میں تھے کی پنچایت بیٹھی، لیکن جیت بہر حال سارہ کے بابا کی ہوئی کیونکہ ان کا ساتھ تمام ٹیچروں کے علاوہ ٹیچروں سے متعلق تمام لوگوں نے دیا تھا۔

اس طرح لڑکوں کے بیچ میں یہ اکیلی بچی پڑھنے لگی، اور اگلے سال کے امتحان میں پورے اسکول میں ٹاپ کیا۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا، اور سارہ بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسی سے شادی کرے گی جو اسے ٹوٹ کر چاہے۔ ایک دن جب وہ اسکول سے لوٹ رہی تھی تو سورج کی کرنیں شہتوت کی شاخوں پر

سیدھی پڑ رہی تھیں اور شاخوں پر جمی برف، بوندوں کی شکل میں بدلتی ہوئی ٹپ ٹپ نیچے گر رہی تھیں۔

کچھ ہی دوری پر چراگاہ میں سفید بھیڑوں کے بچوں کا جھنڈ کھیل رہا تھا۔ اور چراگاہ سے لگی پہاڑی کی چوٹی پر ایک سنہری چڑیا بیٹھی اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئی چہک رہی تھی۔

اوپر آسمان پر سرمئی سفید بادلوں سے نیچے بڑے بڑے بگلے محو پرواز تھے، اور جھیل میں سے کنول کی گلابی کلیاں سر نکال کر ننھی ننھی معصوم بچیوں کی مانند مسکرا رہی تھیں۔

سارہ کے ذہن نے اچانک انگڑائی لی اور اس کا ہاتھ اپنے بستے میں چلا گیا۔ وہ وہیں بیٹھ کر لکھنے لگی۔

اور جب اسکول کے سالانہ فنکشن میں اس نے وہ نغمہ سنایا تو ساری وادی جھوم اٹھی۔ اس کی پہلی تخلیق پر اسے پہلا انعام ملا تھا، اور پھر اس کا قلم چل پڑا۔ اس کے نغمے وادی کے ذرے ذرے میں گونجنے لگے۔ اور ایک دن جب اس کے پہلے مجموعے پر ملک کا سب سے بڑا انعام دیئے جانے کا فیصلہ سنایا گیا۔ اسی دن اس کے بابا ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ سارہ کا خواب بکھر گیا۔ اب وہ اپنی بھیڑوں کو خود چراگاہ تک لے جاتی۔ اپنے انگوروں کے باغ کی دیکھ بھال خود کرتی اور اپنے چاول کے کھیتوں میں خود دھان روپتی، اس کام میں اڑوس پڑوس والے اس کی مدد کر دیا کرتے تھے۔

ایک دن جب وہ چراگاہ میں اپنی بھیڑوں کو چرنے کے لئے چھوڑ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی کہ اس کا عرصے سے کھویا ہوا فن پھر جاگ اٹھا، اور اس نے ایک نظم لکھنے کی سوچ لی۔ اس کے کھانے کے تھیلے میں اب بھی تھوڑے سے کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ ایک پنسل بھی تھی۔

ایک چکنے درخت کے تنے سے کاغذ ٹکا کر اس نے ابھی پنسل اٹھائی ہی تھی کہ جھیل کے پانی میں اُبال آ گیا، لہریں کنارے تک چڑھ گئیں۔ اور پانی کے ڈر سے ایک بوڑھی

بھیڑ ممیا کر سارہ کی طرف دوڑ آئی۔

کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا اور ایک ٹیلے کے اوپر اُگی جھاڑیوں میں اٹک کر پھڑ پھڑانے لگا۔

بھیڑ کو تسلی دے چکنے کے بعد سارہ نے اسے پھر گھاس کی طرف بھیج دیا تھا۔ اور خود اس کاغذ کے ٹکڑے کو جھاڑی سے نکال لانے کے لئے دوسری طرف چلنے لگی تھی۔ مگر ٹیلے کے کنارے جونہی اس کی نظر گئی، کاغذ کو بھول کر دوسری طرف چل دی۔

مَیالے خاکی کپڑوں میں ملبوس، خون میں لتھڑا ہوا کوئی شخص وہاں پڑا ہوا تھا۔ وہ کوئی فوجی لگتا تھا، جنگیں اس وقت جھٹ پٹ ہوتی ہی رہتی تھیں۔ سامنے والی پہاڑی سے جانے والا راستہ پڑوسی ملک کی سرحد سے ملتا تھا۔ وہ بیہوش تھا۔ سارہ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دور اوپر دائیں جانے والی پہاڑی پر کچھ چرواہے درختوں کے تنوں سے ٹیک لگائے اپنی اپنی بھیڑوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس نے زور زور سے آواز لگائی تو وہ اتر کر نیچے آگئے اور ان سب کی مدد سے زخمی فوجی کو اپنے گھر لے آئے۔ پھر ان سب نے مل کر اس کے زخم کو صاف کئے اور جڑی بوٹیوں کا لیپ چڑھا کر چلے گئے۔ کئی دن بیت گئے۔ سارہ نے اس اجنبی کی خوب دیکھ بھال کی تھی اور ایک دن جب وہ پڑوسیوں کو بھیڑ کا دودھ پہنچا کر واپس لوٹی تو اس نے دیکھا وہ اجنبی تکیے سے ٹیک لگائے گُم صُم سا چھت کو تاک رہا ہے۔ سارہ اس کے لئے گرم دودھ کا پیالہ بھر کر گئی تھی۔ وہ پیالہ اب تک ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے اجنبی؟ تم نے اب تک دودھ پیا کیوں نہیں''؟ سارہ نے پوچھا۔

''میں اب لڑنا نہیں نہیں چاہتا، اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ جانے کب ختم ہوگی یہ جنگ۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ سارہ کی بات اس نے سنی ہی نہیں تھی اور جب سارہ نے اسے دوبارہ ٹوکا تو وہ چونک گیا۔ پلٹ کر اس نے دیکھا تو سارہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھری ہوئی ہیں۔

''میں۔میں اب لڑنا نہیں چاہتا سارہ! میں تمہاری کھیتوں میں چاول اُگانا چاہتا ہوں۔تمہارے انگورے کے باغ کی رکھوالی کرنا چاہتا ہوں اور تمہارے بھیڑوں کا دودھ دوہنا چاہتا ہوں، کیا تم مجھے اس کی اجازت دے سکوگی''؟

''لیکن یہ حق تو میں سے ہی دے سکتی ہوں جو میرا اپنا ہو اور میرا اپنا وہی ہوگا جسے میں ٹوٹ کر چاہوں اور ابھی میں نے ایسا محسوس نہیں کیا۔تم ایسا کرو اجنبی! ایک جنگ اور لڑلو۔جب اگلے سال تم لوٹ کر آؤگے تب تک شاید میں تمہیں پیار کرنے لگوں''۔سارہ نے کہا تھا۔

سارہ کی یہ بات سن کر اجنبی لوٹ گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ ''میرے لوٹ آنے تک اگر تم کسی کو چاہنے لگو تو اسے ضرور اپنا لینا''۔

سارہ اپنے کھیت کی منڈیر پر کھڑی دور وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔آج اس نے میٹھے چاول اُبالے تھے۔اور بھیڑوں کا دودھ دوہ رکھا تھا۔

لیکن کئی بہاریں آکر گزر گئیں۔اجنبی لوٹ کر نہ آیا۔

سارہ کے سفید بال اس کے شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔انگوروں کی بیلیں مرجھا گئی تھیں۔کھیتوں میں سوکھ پڑا تھا۔بھیڑوں کا باڑا سنسان تھا۔

چاول کی ہانڈی میں چاول کے دانے نہیں بچے تھے۔اور سارہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی:

''کئی موسم آکر بیت گئے۔میرے کھیتوں میں سوکھا پڑ گیا ہے۔میری بھیڑیں مر گئی ہیں۔

میرے کھیتوں پر ایک بادل آکر لوٹ گیا اور وہ برسا نہیں۔اب میرے کھیت میں چاول کبھی نہیں اُگیں گے۔

اے اجنبی کیوں مان لی تھی تم نے میری بات؟''

تبھی ایک آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر اس کی طرف لوٹ آئی:

"کیوں کہ وہ تم نے کہی تھی!"

سارہ نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ڈھلتی شام کے سائے میں لپٹا ہوا ایک ادیہ لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھڑی تھی۔

"کون ہو تم؟" سارہ نے پوچھا۔

"یہ میں ہوں سارہ۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا؟"

سارہ کی آنکھیں چھل چھل ہو گئیں۔

"اب آئے ہو تم؟ اتنی دیر کیوں کر دی تم نے؟ اب تو بہار آ کر لوٹ گئی۔ میرے کھیتوں میں سوکھ پڑ گیا ہے، میری دھرتی بنجر ہو گئی ہے اور چاول کی ہانڈی میں یک دانہ بھی نہیں بچا۔ تم کیا کھاؤ گے اجنبی؟"

اس نے کہا "اب تمہارے کھیتوں میں چاول اُگاؤں گا، تمہاری بھیڑوں کو چراگاہ تک لے جاؤں گا۔ ورانگوروں کے باغ کی سینچائی کروں گا۔ اور جب نئے دھان اُگ آئیں تو تم میرے لئے میٹھے چاول اُبال دینا۔" سارہ نے کہا

"اب۔ اب تو بہت دیر ہو چکی اجنبی! میرے تمام بال سفید ہو گئے ہیں۔" سارہ نے کہا:۔

"اور میں بھی دیکھ نہیں سکتا۔ اتنے دن میں دشمنوں کی قید میں تھا۔ جیل کی صعوبتوں نے میری آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے۔ لیکن میں تمہارے وجود کی خوشبو محسوس کر سکتا ہوں۔

اور تم میرے لئے آنکھیں بن سکتی ہو!"

سارہ نے اس کی دھندلی آنکھوں میں اپنی آنکھیں سمو دیں۔ اور ٹھیک اسی وقت

آسمان پر بادل گھر آئے۔

اس نے کہا۔

''وادی کا گیت، پھر گونجے گا سرہ، کیونکہ نغمے کبھی نہیں مرتے!''

☆☆☆☆☆
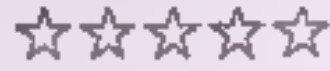
قیدی روحوں کی آوازیں

ٹرین اپنی پٹریوں پر دوڑنے لگی ہے۔اور گلابی پتھروں والا قلعہ نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔اس مسلسل سفر کے دوران مجھے جہاں جہاں رکنا پڑا ندیوں، پہاڑیوں اور کھنڈروں نے مجھے ان گنت کہانیاں سنائی ہیں۔میرے پاس کہانیوں کا انبار جمع ہو گیا ہے اور میں سوچ رہی ہوں کہ ان سب کا بوجھ اپنے کمزور کاندھے سے کیا اٹھا سکوں گی؟

میرا سفر تو جاری ہے نہ جانے کب تک جاری رہے گا اور مجھے معلوم ہے کہ ابھی اور کئی کہانیاں میرا پیچھا کرتے کرتے میرے کاندھے پر سوار ہوں گی میرا بوجھ بڑھتا ہی جائے گا اور اس بوجھ کو لئے مجھے چلتے رہنا ہوگا شاید آخری سانسوں تک۔تب تک جب تک کہ اسی سفر کے دوران کسی پٹری پر پڑا ہوکوئی بارودی گولا میرے وجود کے پرخچے نہ اڑا دے۔

اس وقت جب میں نے اس گلابی پتھروں والے قلعے سے جڑے اس کھنڈر نما مکان کی چوکھٹ پر قدم رکھا تھا تو ان گنت سسکیوں نے میرا استقبال کیا تھا۔یہ سسکیاں شاید ان روحوں کی تھیں جو ان دیواروں میں قید کر دی گئی تھیں۔

روحوں کی آوازیں جو سناٹے کے پتھروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے لہولہان ہو گئی تھیں ۔ان آوازوں کو میں نے بالکل صاف سنا تھا۔وہ میرے کانوں میں سرگوشی کر رہی تھیں۔

''ہماری نشانیاں اس گلابی قلعے میں قید ہیں، ہمارے اجداد کی روحوں نے جب ہمیں پکارا تھا ہم گہری نیندیں کھوئے ہوئے تھے۔ ہماری نیند کا فائدہ اٹھا کر ہماری تہذیب کے لوگوں نے ان دیواروں میں چن دیا۔ ہماری تلواریں زنگ آلود ہوکر عجائب دھول میں اٹے شیشے کے بکسوں میں بند ہو گئیں۔ اب ہم ان نشانیوں کے قریب تک نہیں جا سکتے۔ کیونکہ ہم نے اپنی پہچان کھو دی ہے۔ وقت کسی

کے لئے رکا نہیں رہتا۔ ہماری مٹھیاں اتنی مضبوط نہیں رہیں کہ وقت کو پکڑ سکیں ہماری انگلیاں جزام زدہ ہوکر سکڑ گئی ہیں۔ اپنے ہی اجداد کی نشانیوں کو محض دیکھنے کے لئے بھی ہمیں کسی اور کے سہارے کی ضرورت ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا، شیش محل کا دان دے دینے والوں کے پاس ایک جھونپڑی بھی نہیں بچی؟ تمام عمارتوں کے کھنڈروں پر کسی اور نام کا لیبل چسپاں کر دیا گیا اور ہم احساس بھی نہ کر سکے۔!

''وہ دیکھو گنگا کیسے سر پٹک رہی ہے؟ کیا کہہ رہی ہے وہ؟'' دیواروں میں قید روحوں کی آواز سے توجہ ہٹا کر جب میں نے گنگا کی آواز سننے کی کوشش کی تو سچ مچ اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ پل بھر کو مجھے خیال آیا کہ شاید میں صوفی ہوگئی ہوں، یا پاگل ہوگئی ہوں۔ اس سے پہلے کسی اور کی آوازیں کیوں نہیں سنیں؟ مگر گنگا سچ مچ بول اٹھی تھی میں نے اس کی آواز بالکل صاف سنی تھی۔

''مجھے میرے اجداد کے قدموں سے دور کر دیا گیا ہے۔ میرے بزرگوں کی شفقت کا سایہ چھین لیا گیا ہے، میرے راستوں پر کچروں کا انبار لگا دیئے گئے ہیں، میرے جھل جھل چمکتے پانی میں جس میں کبھی سورج نے منھ دھویا تھا خون کی بساندھ گھول دی گئی ہے۔ میں جو پوتر تا کا سروت تھی اب میلے کچیلے غلیظ پانی کا کفن اوڑھے کھڑی ہوں۔ میری لاج کی چادر میرے ہی بیٹوں نے اتار لی ہے۔ میری آنکھوں کا کاجل ڈھل گیا ہے۔ میری کلائیوں میں کھنکتی ہرے کانچ کی چوڑیوں کا رنگ اڑ گیا ہے۔ میرے بیٹوں نے میرے ماتھے کی ''دگ دگ'' کرتی بندیا نوچ ڈالی ہے اور اس کی جگہ ایک داغ ڈال دیا ہے بدصورت اور گھناؤنا سا۔

میں اب وہ نہیں رہی جو کبھی صبح سویرے سورج کی کرنوں سے مانگ بھر کر اپنے اجداد کی قدم بوسی کرنے کے بعد اپنے ریشمی بالوں کو لہراتی، بل کھاتی ہوئی اپنی منزل کی طرف چلا کرتی تھی۔ اور میری پاکیزگی کا لمس پانے کے لئے اپنی اپنی چھتوں پر کھڑے لوگوں کی نگاہیں بے چین رہا کرتی تھیں۔ میرے پانی کی ایک ایک بوند ان کے اندر بہت دور دور تک پاکیزگی کے اجالے بھر دیا کرتی تھی اور۔

''بٹو ... . اوبٹو . ... ''

ویران کھنڈروں میں بھٹکتی ہوئی روح کی مانند شجو بھائی کی آواز نے مجھے چونکا دیا تھا میں جو بڑے انہماک کے ساتھ گنگا کی فریاد سن رہی تھی، میری محویت ٹوٹ گئی، گنگا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی، دیواروں نے چپ اوڑھ لی، تو میرے ہونٹ کھلے۔

''بھیا یہ گنگا ... ..!'' میں نے اپنی آواز دیواروں کے اندر سے آتی سنی تو ڈر کر اپنے کان بند کرنے کی کوشش میں پنی انگلی زخمی کرگئی۔

اس گنگا نے تو اپنا راستہ ہی بدل لیا ہے بٹو......!'' بھیا نے کہا تو مجھے لگا کہ میں ابھی زندہ ہوں میری آواز ان دیواروں میں قید نہیں ہوئی ہے۔تب میں نے ہمت جٹا کر شجو بھائی سے کہا تھا۔

''میں نے ابھی ابھی اس گنگا کی باتیں سنی ہیں۔ بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔اس نے مگر کون سمجھے گا اس کی زبان؟ اور میں جو کہوں تو لوگ مجھے پاگل کہیں گے، اور میں بھی اپنے اجداد کی روحوں کی طرح جو ان دیواروں میں قید ہیں، پاگل کہیں گے اور میں بھی اپنے اجداد کی روحوں کی طرح، پاگل خانے کی قیدی بنادی جاؤں گی'۔

بھیا نے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور پیر بڑی بڑی سیاہ چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے اور زنجیر زدہ ہیں۔ میں ان دیواروں میں قید ہو جانے کے لئے مجبور ہوں۔ ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہمارے پاس اپنی کوئی پہچان نہیں رہی۔ کسی ایک کے جاگنے سے ہو ہی کیا جائے گا؟ چلو تمہارے لوٹنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

میرا سفر ایک بار پھر شروع ہو کر تھوڑی دیر کو ٹھہر گیا تھا اور میری نگاہیں رکشے کی تلاش میں جٹ گئی تھیں۔ میں کاندھوں سے لدے اپنے وجود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی کہ پھٹی پرانی قمیص میں ملبوس ٹھنڈ سے کانپتا ہوا ایک ادھیڑ عمر کا رکشے والا آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''کہاں جانا ہے بی بی؟'' میں نے کہا۔

''یونیورسٹی جانا ہے چلو گے؟''

''کیوں نہیں بی بی، ہم تو پیدا ہی ہوئے ہیں لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچانے

کے لئے بھلے ہی ہماری اہمیت کوئی نہ سمجھتا ہو لیکن جس پر وقت پڑ گیا اسی نے جانا ہوگا۔
کہنے والے تو کہتے ہیں رکشے والوں کا دماغ چڑھ گیا ہے۔'' رکشے والے کی بات مجھے فلسفیانہ لگی تو بات ٹالنے کو میں نے پوچھا۔

''کرایہ کیا لوگے؟'' کہنیوں کی دنیا پیچھے رہ گئی اور ضرورت منہ کھول کر کھڑی ہوگئی۔

''کرایہ تو سات روپے لوں گا بی بی۔'' اس نے کہا۔

''مگر ایسا کیوں؟ وہاں تک کے تو دن میں چار ہی روپے ہوتے ہیں اور رات میں چھ روپے اور ابھی تو رات بھی زیادہ نہیں ہوئی۔'' میں نے رات کے گہرے سناٹے سے آنکھ چرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں بی بی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں غلط نہیں بولوں گا مجھے پیسوں کی ضرورت ہے اس لئے ایک روپیہ زیادہ مانگ رہا ہوں۔''

''مطلب ....؟''

''مطلب یہ کہ میرا بھائی مر گیا ہے، یا مار ڈالا گیا ہے۔ اور میرے اوپر دو گھروں کی ذمے داری آ گئی ہے۔''

''کیسے مرا وہ، کس نے مار دیا اور کیوں؟''

''کیوں کیا بی بی! لوگ ہر روز مارے جاتے ہیں، کیا ہر روز کا اخبار کسی نہ کسی کے مارے جانے کی خبر نہیں لاتا؟ میرا تو خیال ہے کہ مرنے والے خود نہیں جانتے کہ جب دھرتی خالی ہو جائے گی تو زمین کے ٹکڑے کس کے کام آئیں گے؟''

رکشے والے کو طول کھینچتے دیکھ کر میں نے ٹوکا۔

''تمہارا بھائی کیا کرتا تھا؟''

''رکشہ چلاتا تھا وہ بھی بدایوں میں۔ جب بی۔ اے پاس کرنے کے بعد بھی دو سال تک نوکری نہیں ملی تو رکشہ چلانے لگا۔ جس دن گھر سے رکشہ لے کر نہ نکلتا اس دن بچے بھوکے ہوتے۔ بھیا کی حالت دیکھ کر میں نے بھی پڑھائی چھوڑ دی۔ کیا فائدہ ایسی پڑھائی کے پیچھے پیسہ جھونکنے کا جو ایک وقت کی روٹی بھی نہ دے سکتی ہو۔''

سو اس دن بھی رکشہ لے کر نکلا تھا وہ، اسے معلوم نہیں تھا کہ اندرونی علاقے میں کرفیو لگا ہوا ہے۔ ٹرین پورے چھ گھنٹے لیٹ تھی۔ پچھلے اسٹیشن پر کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ جب گاڑی آئی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ٹرین سے تین زنانی سواریاں اتری تھیں۔ دو جوان لڑکیاں ایک ان کی ماں اور میرا بھائی ان کے بتائے پتے پر انہیں لے کر چلنے لگا۔ وہ جلد سے جلد ان عورتوں کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے گھر کو لوٹنے کی فکر میں تھا۔ کہ اچانک نجم آباد علاقے میں چار سپاہیوں نے اس کا رکشہ روک دیا۔

''سالا۔۔۔۔۔ رکشہ چلاتا ہے معلوم نہیں ادھر کرفیو لگا ہوا ہے۔''

''نہیں صا۔۔۔ب مجھے ان باتوں کا کیا پتہ؟ غریب آدمی ہوں۔ اب تو غلطی ہو گئی زنانی سواریاں ہیں انہیں پہنچا لینے دو پھر غلطی نہیں کروں گا۔ ٹرین لیٹ نہ ہوتی تو ایسی نوبت نہ آتی۔ اس وقت کہاں جائیں گی بیچ راستے پر اتر کے؟''

''ہوں۔۔۔۔ بڑی ہمدردی ہو رہی ہے ان سے۔ اچھا تو اپنی ذات تو بتا ۔۔۔۔'' ایک سپاہی نے دوسرے سپاہی کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

''سچ بی بی، اور یہ بھی سچ ہے کہ اس وقت کرفیو ہٹا ہوا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک نیتا نما شخص سواری کو لے کر ہمارے ہی بھائی کے ساتھ رکشے والا ادھر سے گزرا تھا۔ اسی نے بتایا آ کر۔ پھر یوں ہوا کہ زنانی سواریوں کو چار سپاہیوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ پانچویں نے بندوق تانی۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔

کھڑے کھڑے گولی، مردی بی بی۔۔۔۔ چھلنی چھلنی ہو گئے وہ۔۔۔۔۔

میں کئی دن پاگلوں کی طرح پھرتا رہا، اسے ڈھونڈتا رہا۔ جب لاوارث لاشوں کے ڈھیر میں سے میں نے اس کی لاش پہچانی تو وہ گل چکی تھی۔ سڑی لاش لا کر دفن کی ہم نے کیا کہوں اب تو قبرستان میں بھی جگہ نہیں رہی۔ ندیوں کی گہرائی لاشوں سے پٹ کر اتھلی ہو گئی ہے۔ پانی غلیظ ہو گیا ہے۔

میں نے اپنی پوری کمائی بھابھی کے سامنے ڈال دی میرے اپنے بچے دو دن بھوکے رہے، برادری والوں نے تھوڑا بہت چندہ بھی کیا مگر اس سے کتنے دن کی روٹی چلتی؟

یہ پیٹ کی بھوک بڑی بری ہوتی ہے گزر جانے والوں کا سوگ بھی منانے نہیں دیتی۔

''و بی بی۔۔۔۔۔آپ کی منزل آگئی''۔رکشے والے کی آواز سن کر میں چونک پڑی ہوں۔اس سفر میں بار بار چونکی ہوں میں۔۔۔۔۔

''منزل؟نہیں رکشے والے ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔ہماری منزلیں ہم سے بہت دور جا چکی ہیں۔لو بیا اپنے پیسے لو''۔

''دس روپے؟نہیں بی بی صرف ایک روپے زیادہ مانگا تھا۔باقی بچے تین روپے کسی اور کو دے دینا۔ابھی آپ کو بہت دور تک چلنا ہے۔ہر جگہ ہر علاقے میں کوئی نہ کوئی میرے جیسا ضرور ملے گا۔

بہت ملیں گے مجھ جیسے ۔ میرٹھ میں،بدایوں میں، بھاگلپور میں،کس کس کی ضرورت پوری کرسوگی؟کس کس کو لوٹا سکوگی اس کی پونجی،کسی کا باپ،کسی کا شوہر کسی کا بیٹا۔ملک کے اس چھور سے اس چھور تک ہر کسی کا کچھ نہ کچھ لٹ گیا ہے۔یہ تین روپے کہیں نہ کہیں تمہارے کام ہی آئیں گے''۔

رکشے والا تین روپے میرے ہاتھوں میں تھما کر کہیں اندھیرے میں گم ہو گیا ہے۔

میری سوچوں کے دائرے ایک بار پھر پھیل گئے ہیں۔گنگا نے سچ ہی کہا تھا۔ راستے میں لاشوں کے ٹیلے کھڑے ہوں تو کوئی اپنی منزل تک کیسے پہنچے گا بھلا؟

گنگا کی سسکیاں ایک بار پھر میرے کانوں میں گونجنے لگی ہیں۔سورج نے بہت دیر پہلے اپنی کرنیں پوری طرح سمیٹ لی ہیں اب اس کے پاس ہمارے لئے کچھ نہیں بچا ہے۔

ٹرین ایک بار پھر نئے راستوں کی طرف چلنے کو تیار ہو چکی ہے اور ....اگلی پٹریوں پر کئی بارودی گولے اسکے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆

بند دروازوں کے پیچھے

دوسروں کے دکھوں کے دروازے کی درازوں کے اندر جھانکنے کی ہمت کسی میں کیوں نہیں ہوتی، یہ بات میں نے ابھی ابھی جانی ہے۔ لیکن اس حقیقت کو جان لینے کے بعد میری ہمت کے دروازے تین گنا اونچے ہو گئے ہیں۔

اب سے پہلے مجھ پر بھی یہ دروازے بہت چھوٹے تھے۔ اتنے چھوٹے کہ بالکل نیچے جھک کر ہی اندر سمانا ممکن ہو سکتا تھا۔ اور جب اپنے آپ ہی جھک جاتے تو کہیں کچھ نہیں بچتا۔

آج مجھے ایک راستے نے اپنی طرف جو کھینچا تو جانے کیسے میں اس چوکھٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا، جس کے بند پٹوں کے پیچھے سے ایک سوال جھانک رہا تھا۔

اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں اب یہاں تک آ پہنچا ہوں جہاں آس پاس بموں کے دھماکے گونج رہے ہیں۔

اور اب اپنی تین منزلہ عمارت کی چھت پر کھڑا جھونپڑیوں کے جلنے اور کھوپڑیوں کے چٹخنے کا تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ہی دیر پہلے سب کچھ کتنا پرسکون تھا کہ اچانک ہی جیسے جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ سوڈا واٹر کی بوتلیں چٹخنے لگیں۔ بم گولے پھٹنے لگے بندوقیں ان تو پچے خانوں کی طرح گولیاں اگلنے لگیں۔

بات کسی کی نہیں تھی، نہ اس ادھیڑ عمر عورت کی نہ اس سائیکل سوار لڑکے کی۔ کیوں کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کا درد جان لیا تھا۔ اور ایک دوسرے کو معاف بھی کر چکے تھے۔ عورت جو گھر میں پڑی اپنی اکیلی جوان بیٹی کی حفاظت کی خاطر اپنا کام ختم کر کے جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہ رہی تھی۔ اور لڑکا جو اپنی دم توڑتی ماں کی دوا کے لئے دوڑا چلا جا رہا تھا۔

دونوں کا مذہب الگ تھا۔ لیکن درد ایک تھے۔ عورت نے لڑکے کو ایک طمانچہ مارا تھا۔ اور لڑکے نے اس سے معافی مانگ لی تھی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اور اس عورت نے اس لڑکے کا ماتھا سہلا دیا تھا اور بولی تھی۔

''غلطی میری ہی تھی، مجھے اتنی جلدی جلدی سڑک پار نہیں کرنی چاہیئے تھی۔''

پھر جلدی جلدی بھاگنے کی مجبوری دونوں نے ایک دوسرے کو بتائی تھی اور اپنے اپنے راستے چلے گئے تھے۔

لیکن بات ختم نہیں ہوئی اور یہ واقعہ دو گروہوں کا معاملہ بن گیا۔

اب راشنوں کی دکانیں لوٹی جا چکی ہیں۔ غریبوں کے گھر ٹوٹ گئے ہیں۔ اور راشن اٹھانے کے لئے آئی ہوئی وہی عورت لوٹ کر چلی گئی ہے۔ کیوں کہ خود اس کو بھی پتہ نہیں کہ یہ سب کچھ کس لئے ہوا ہے!

اب سسکتا ہوا ایک ہجوم فٹ پاتھ کے پتھروں پر بکھرا پڑا ہے۔ اور اپنی تیسری منزل کے فلیٹ کی چھت پر کھڑا میں سوچ رہا ہوں۔ زندگی کے لمحے کتنے غیر معین ہو گئے ہیں۔ ہر ہاتھ ایک بارودی گولا لئے گھوم رہا ہے۔ ہم نے، تم نے اور سب نے اپنی موت آپ طئے کر لی ہے۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب کالج کے پرنسپل کی میز پر میں اپنے استعفے کا کاغذ رکھ کر چلا آیا تھا، اپنے ایک ساتھی لیکچرر کے کہنے پر اور آج صبح مجھے پتہ چلا کہ مجھے استعفے کے لئے اکسانے والا ساتھی بیس ہزار روپے دے کر خود پرمانینٹ ہو گیا ہے۔

اپنا فیصلہ خود نہ کر پانے کی بزدلی نے مجھے بہت پیچھے دھکیل دیا تھا! میں اپنا فیصلہ کرتے وقت ڈگمگا جاتا ہوں یہ میری بہت بڑی کمزوری ہے۔ میں جانتا تھا۔ پورے چار سال سے جانتا تھا کہ تم نے میرے آس پاس رہ کر ہمیشہ مجھے چھونے کی کوشش تھی، کیوں کہ رشتوں کا تصور اب وہ نہیں رہا جو کبھی ہوا کرتا تھا۔ استاد اور شاگرد کے بیچ کا رشتہ! اور فیصلے کی ڈگمگاہٹ نے مجھے یہاں بھی توڑنے کی کوشش کی تھی، جب کالج سے باہر نکلتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گلیارے کے آخری سرے پر تم پہرے دار بن کر کھڑی ہو! اُس

پل میں نے بھی اچانک وہی سوچا تھا جو تم پچھلے چار سال سے سوچتی چلی آرہی تھیں۔
تبھی وہ بند دروازہ میرے سامنے آگیا تھا جس کی درازوں کے اندر جھانکنے پر میرے سامنے ایک نئی دنیا آباد ہوگئی تھی۔ میں پل بھر میں ہی خود کو بہت مضبوط محسوس کرنے لگا تھا۔ اور یہ سوچنے لگا تھا کہ تمہارے پاس کیسی آنکھیں ہیں جو اتنے سال اس دنیا کے قریب رہ کر بھی روشنی ڈھونڈھ نہیں پائیں۔

ان درازوں کے پیچھے میں نے وہ ہاتھ دیکھے تھے جو سارا دن بلیک بورڈ پر اپنی انگلیاں گھسنے کے بعد شام کو کسی اور کے لئے گول گول سوندھی اور بادامی روٹیوں کی تخلیق کرتے ہیں۔ ان پر توے کی سیاہی لگ جاتی ہے اور وہ دوسروں کیلئے دودھ جیسے اجلے چاول ابالتے ہیں۔

صاف ستھرے آنگن کے ایک کونے میں بنے چولہے سے جڑے چبوترے پر ہری ہری سبزیوں کو دھو کر چھیل کر نئے نقوش عطا کرتے ہیں۔ اور چبوترے کے نیچے پیروں کے پاس، ایک کالی چمکیلی سی مرغی اپنے ننھے ننھے چوزوں کو اپنے پروں میں سمیٹے بڑی شرافت سے بیٹھی اپنی چھوٹی سی چونچ سے سفید ساڑی کے آنچل کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھینچ کر اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہوتی ہے۔ اور جھکی ہوئی پلکیں اٹھے بغیر آنے والے کی آہٹ کو محسوس کرلیتی ہیں۔ اور پل بھر میں چائے کی میٹھی خوشبو سارے آنگن میں پھیل جاتی ہے! اور تم پورے بیس سال تک ان ہاتھوں کے آس پاس رہ کر بھی ان کی شناخت نہیں کرسکیں۔

تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ان دو ہاتھوں نے تنہا پورے بیس سال تک تمہارا بوجھ کیسے اٹھایا ہوگا؟

آج ایک ہی پل میں میں نے ان ہاتھوں کو پہچان لیا ہے! سنا ہے ایک جلاہے نے زندگی بھر خواب بننے کی کوشش کی پھر بھی خود کسی کا خواب نہیں بن سکا۔

میں وہ نہیں ہوں۔ میں تو وہ ہوں جو ان تمام بنے ہوئے خوابوں کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر، کوئی ایک اکیلا دھاگہ اوڑھ کر جاڑے کی کڑکڑاتی رات بتا سکتا ہوں۔ یہ میں نے ان درازوں کے اندر جھانکنے کے بعد جانا ہے۔ اور اس دروازے

تک پہنچانے کا سہرا آج میں تمہارے سر باندھ رہا ہوں۔ اور دوسروں کے دروازے کے اندر جھانکنے کا گنہہ گار ہو کر بھی خود کو تھوڑے ثواب کا حقدار سمجھنے لگا ہوں۔

انشو، تمہاری کھلی ہوئی محرابوں کے دونوں طرف تو ہزاروں سر جھکے ہوئے ہیں۔ اور تم جب چاہو انگلی کے صرف ایک اشارے سے کسی بھی سر کو اپنے قدموں میں ڈال سکتی ہو۔

لیکن ان بند دروازوں کے پیچھے کون سی آنکھیں دیکھیں گی؟ یہ میں تم سے پوچھ رہا ہوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس سوال کا جواب دینا تمہارے لے بڑا مشکل کام ہوگا۔ اس لے زندگی کے اس غیر معین لمحے میں، میں ایک فیصلہ کر لینا چاہتا ہوں۔ وہ فیصلہ جو میرا اپنا ہوگا۔ اگر ابھی بھی بارود کا کوئی گولہ میری کھوپڑی کے ٹکڑے نہ بکھیر گیا تو ذرا سی مہلت پاتے ہی میں اس دروازے کی درازوں میں سما جاوں گا، جس کی چوکھٹ میرے سر سے صرف پانچ انگل اونچی ہے۔ یوں بھی نیچی چوکھٹیں اکثر سروں کو زخمی کر ڈالتی ہیں۔

آج جب تم تک میرا یہ پیغام پہنچے گا تمہاری آنکھوں آنکھوں سے یقینی طور پر دو بوندیں نکل کر جب تمھارا دامن بھگونے کی کوشش کرینگی تو وہی دو ہاتھ ہوں گے جو لپک کر ان قطروں کو اپنے آنچل میں سمیٹ لیں گے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ اور تم پھر بھی انہیں نہیں پہچانو گی۔

کیا یہ سچ نہیں ہے؟

ہے نا یہ سچی بات؟ تو آؤ میں تمہیں ان ہاتھوں کی پہچان کرا دوں۔

یہ ہاتھ تمہاری ممی کے ہیں انشو۔

آج پہلی بار میں نے ہمت کا کام کیا ہے۔ اور خود کو ایک بھرا پرا مضبوط آدمی محسوس کر رہا ہوں۔ آج کے اس فیصلے میں میرا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ ایک ساتھ میں نے کئی مقام حاصل کر لئے ہیں۔ اب میں ایک پورا آدمی بن گیا ہوں۔ میں جو ایک بیٹا ہوں، میں جو ایک بھائی ہوں، ایک شوہر ہوں، اور ان سب سے بڑھ کر ایک باپ ہوں۔ ایک مضبوط مرد، جو اپنے فیصلے خود کر سکتا ہے!!

☆☆☆☆☆☆☆

KHOYE HUYE LAMHON KI SADA

(A Collection of urdu Stories)

by

Sheerin Niazi

Compiled and Edited by

Dr. Wakil Ahmed Rizvi

Sheerin Niazi

شیریں نیازی کے متعلق سرسری مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تقریباً نصف صدی سے لکھ رہی ہیں۔ اس طویل مدت میں جتنا کچھ لکھا جا سکتا تھا، اتنی تصنیفات ان کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اور جو چیزیں چھپی ہیں وہ بہر حال قابل مطالعہ ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی مجبوریوں اور مزدوروں کی بدحالیوں کا ذکر بہتر طریقے سے کیا ہے۔ مجھے ان کے تمام افسانوں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہے، لیکن جو کچھ بھی دیکھا یا پڑھا ہے، اس سے اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ان کا افسانوی کینوس بہت وسیع نہیں لیکن ان معنوں میں اہم ضرور ہے کہ انہوں نے جس طبقے کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہے، اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے اندر کسی واقعہ کے مشاہدہ اور اس کی پیش کش کی صلاحیت بہت بہتر ہے اور وہ کہانی لکھنے کے آرٹ سے واقف ہیں۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں زیر نظر افسانوی مجموعہ پسند کیا جائے گا۔

ڈاکٹر (پروفیسر) قمر جہاں

سابق صدر شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی، بھاگلپور (بہار)

شیریں نیازی جھارکھنڈ کی خاتون افسانہ نگار ہیں، اس لئے ان کے یہاں بہار اور چھوٹا ناگپور کی تہذیب و تمدن کی مشترکہ جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کے تقریباً تمام افسانے قدیم اور کلاسیکی افسانوی پگڈنڈیوں پر سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ آج بھی قاری کا ایک طبقہ اس قسم کے افسانوں کو پسند کرتا ہے۔

شیریں نیازی بیک وقت اردو اور ہندی دونوں میں لکھتی ہیں۔ اگر انہوں نے ایک زبان پر اپنی توجہ مبذول کی ہوتی ہے، تو میرے خیال میں وہ مزید اوپر جا سکتی تھیں۔ پھر بھی جھارکھنڈ کے ایک قصباتی علاقے کے ایک کوارٹر میں محصور و مقید ہو کر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جانا چاہئے۔ ایسی خواتین جو وہ بڑی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے زبان و ادب اور تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں، وہ ستائش کی مستحق ہیں اور ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس افسانوی مجموعہ کو لوگ پسند کریں گے۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین

صدر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی، رانچی (جھارکھنڈ)